داستانِ زبانِ اردو

ڈاکٹر شوکت سبزواری

انجمن ترقّی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ
کراچی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۴۵۸

تعداد .... ایک ہزار
باردوم .... مارچ ۸۷ء
طابع .... انجمن پریس۔ کراچی

انجمن پریس میں کلیم الحسن تقوی کے اہتمام سے طبع ہوئی

فہرست مطالب

پیش لفظ

میرا تحقیقی مقالہ "اُردو زبان کا ارتقا" ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں اردو زبان کا نشو و نما دکھایا گیا تھا اور اس کے صرفی، نحوی، صوتی سرمایے کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد اس کے آغاز اور ماخذ کے متعلق کچھ مختصر سے اشارے کیے گئے تھے۔ "داستان زبان اُردو" ان مختصر اشارات کی ترجمان ہے۔

اُردو میں اُردو زبان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود اُردو کا ارتقا، نشو و نما، مزاج و منہاج، فطرت، سرشت ہنوز تاریکی میں ہے۔ اُردو آریائی خاندان کے کس گھرانے سے ہے برصغیر پاک و ہند کی جدید آریائی نسل کی زبانوں اور بولیوں سے اس کا کیا رشتہ ہے، اس کے موجودہ خط و خال کب اور کہاں اُبھرے، اُن زبانوں سے اس نے کسبِ فیض کیا کن منازل سے گزر کر وہ ارتقا کے اس درجے تک پہنچی؟ ان سوالات کا اردو کے ماخذ اور اس کے آغاز یا ارتقا سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جب تک یہ سوالات حل نہ ہوں اس کا ماخذ طے نہیں ہو سکتا اور اس کے آغاز کے بارے میں صحیح، تعصب سے پاک اور علمی بنیادوں پر استوار رائے نہیں دی جا سکتی۔ اپنے بزرگوں اور دوستوں کی صلاحیتوں اور اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے باوجود مجھے اس کا افسوس ہے کہ اردو کے آغاز کے بارے میں لکھنے والے عام طور سے مذکورہ بالا سوالات اُٹھائے بغیر اس کے آغاز اور ماخذ کی بابت اپنے فیصلے — اور وہ بھی اٹل فیصلے — صادر کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ میں نے ضروری سمجھا کہ اصل اردو کا تاریخی ارتقا دکھاؤں اس کے بعد اس کے آغاز کو بحث میں لاؤں — "داستان" کا موضوع خاص طور سے اردو کا آغاز ہے۔ اس میں شرح و بسط کے ساتھ اس پر بحث کی گئی ہے اور ان تمام سوالات کے جواب دیے گئے ہیں جو اُردو کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی فطرت و سرشت سمجھنے میں معاون ہیں۔ جو اصحاب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں بہت ممکن ہے وہ ان سوالات کا بہتر طور سے اطمینان بخش حل پیش کر سکیں۔ یہ ایک

کوشش ہے اور مخلصانہ کوشش ہے۔ اہلِ علم کوشش سمجھ کر ہی اس پر نظر کریں اور اس کے خلوص کی ــــ اگر اس میں خلوص ہو ــــ قدر کریں ــــ

اردو کے آغاز اور ماخذ کے بارے میں آج تک جو نظریے پیش کئے گئے ہیں ــــ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں قسم کے ــــ ان پر میں نے کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے ــــ اپنی طرف سے میں نے کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا اور نہ اس کی ضرورت تھی ــــ ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ میں پالی کو اردو زبان کی اصل قرار دیتا ہوں یہ درست نہیں۔ میں وہی کہتا ہوں جو جولس بلاک، گریرسن، چٹرجی اور دوسرے آئمۂ فن نے کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو جس زبان سے ارتقا پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اپ بھرنش بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف ادبی روپ ہیں۔ کھڑی یا ہندوستانی (اردو) اس کی فطری ترقی یافتہ (یا بدلی ہوئی) صورت ہے۔ یہ زبانیں اردو کے راست سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔ میں نے "داستان" میں اس بول چال کی قدیم پراکرت اور اپ بھرنش کی تشخیص و تعیین کی کوشش بھی کی ہے اس لئے عام اہلِ علم کی روش سے ہٹ کر اور تاریخی ترتیب بدل کر میں نے اردو کی خصوصیات میں اور ان کی نشان دہی کرتا اور قدیم سے قدیم تر زبانوں میں ان کا کھوج لگاتا اوپر تک چلا گیا ہوں۔ یہ انداز بحث نیا ہے شواہد، دلائل اور امثلہ میں بھی طبعی منہج سے کام لیا گیا ہے۔ نتائج وہی ہیں جنہیں ماہرینِ فن اس سے پہلے وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔

یہ مقالہ اردو کی ایک خصوصی اشاعت میں چھپا تھا۔ نظر ثانی کر کے اور دو نئے باب اضافہ کرنے کے بعد اب اسے کتابی شکل میں طبع کرایا جا رہا ہے۔ میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اسے اس قابل سمجھا کہ رسالہ "اردو" کی ایک اشاعت اس کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ ان کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ یہ مقالہ بالکل نئی شکل میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہو رہا ہے۔ قارئین کو اس میں کتابت کی کچھ فروگذاشتیں نظر آئیں گی۔ مجھے امید ہے ان فروگذاشتوں کا ذمہ دار وہ مجھے اور مولوی صاحب قبلہ کو نہ ٹھہرائیں گے۔

(شوکت سبزواری) ۱۴ جولائی ۱۹۶۰ء

(۱)

"اُردو"

اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں شاہی لشکر یا معسکر یعنی چھاؤنی۔ اردو کو اوّل اوّل زبان اُردوے معلیٰ شاہجہان آباد کہا گیا۔ کثرتِ استعمال کی زبان کا لفظ گرا تو اردوے معلیٰ یا اردوے معلیٰ شاہجہان آباد رہا۔ اس کے بعد صرف اُردو تنہا اردو زبان کے معنی میں ڈاکٹر بیلی کو مصحفی (۱۸۲۴ — ۱۷۵۰) کے یہاں ملا۔

خدا رکھے زباں ہم نے سُنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس مُنہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

ڈاکٹر بیلی کا قیاس ہے کہ یہ شعر ۱۷۷۵ء کے قریب کہا گیا۔[۱] میر تقی میر نے نکات الشعرا (۱۷۵۲ء) میں اردو کو زبان اردوے معلیٰ شاہجہان آباد دہلی کے نام سے یاد کیا ہے۔[۲]

"پوشیدہ نماند کہ در فنِ ریختہ کہ شعرے ست بطورِ شعر فارسی بہ زبان اردوے معلیٰ شاہجہان آباد دہلی کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ"

ذکرِ میر میں ہے :-

بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امروہہ بود بر خوردم۔ آں عزیز مرا

۱؎ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۹۲　　۲؎ صفحہ ۱

تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بہ زبان اردوے معلی بادشاہ ہندوستان کہ دراں وقت، رواج داشت کرد"

ڈاکٹر بیلی کہتے ہیں[۱]۔ "ہو سکتا ہے اردوے معلی سے میر کی مراد فصیح اور مستند اردو زبان ہو میرے خیال میں قلعہ معلی کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی۔ اگر میر کی مراد شستہ اور رفتہ زبان ہوتی تو وہ زبانِ قلعہ معلی کہتے۔

مخزنِ نکات (۱۷۵۴ء) میں قائم فرماتے ہیں[۲]:۔

"اکثر۔ از ترکیبات فرس کہ موافق محاورہ اُردوے معلی باشد بگوش می یابند من جملہ جواز البیان می دانند"

میر کے موزوں طبع صاحب زادے عرش کا ارشاد ہے:۔

ہم ہیں اُردوے معلی کے زباں داں اے عرش
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

شیخ سعد اللہ گلشن نے بقول قدرت ولی کو مشورہ دیا تھا[۳]۔

"زبان دکھنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوے معلی شاہجہاں آباد موزوں بکنید"۔

ڈاکٹر بیلی نے تذکرہ گلزار ابراہیم (۱۷۸۳ء) اور تذکرۂ ہندی مصحفی (۱۷۹۴ء) سے ذیل کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ ان میں زبانِ اردو استعمال ہوا ہے:۔

"تتبع زبانِ اُردو نمودہ" (گلزار ابراہیم زیر ترجمہ وصالت خاں ثابت)

"ادائے زبان اُردو" (تذکرہ ہندی زیر ترجمہ محمد امان نثار)

میر امن باغ و بہار (۱۸۰۱ء) ٹھیٹ اردو میں لکھتے ہیں۔ اس نے زبان اُردو کا ترجمہ "اردو کی زبان" فرماتے ہیں[۴]:۔

---

[۱] جرنل ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۹۴
[۲] صفحہ ۳۲
[۳] جبال پنجاب میں اردو صفحہ ۱۸۔
[۴] باغ و بہار مقدمہ

"حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے۔"

انشاء اللہ خاں انشا دریائے لطافت (۱۸۰۷ء) میں فرماتے ہیں[1]:۔

"خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبانہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ و در بعضے عبارات بکار بردہ زبان تازۂ سوائے زبانہائے دیگر بہم رسانیدند و بہ اُردو موسوم ساختند۔"

حکیم احمد علی یکتا صاحبِ دستور الفصاحت لکھتے ہیں[2]:۔

"اُردو عبارتست از زبانے کہ بعد اختلاط و ارتباط الفاظ پنجابی و میواتی و برج... باکلماتِ فارسی و عربی و دیگر زبانہا... پیدا شدہ"

سترھویں صدی عیسوی میں عام طور سے اُردو کو اُردو کے نام سے پکارا جاتا تھا اور ہر زبان پر اس کا چرچا تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ فرماتے ہیں[3]:۔

"مخلوط اور سلیس بولی اُردو یعنی دربار کی مہذب اور شائستہ زبان جو آج بھی اس حکومت کے وسیع پیمانہ صوبوں میں رائج کرتی ہے کہ کبھی ہندوستان کی قدیم ترین سلطنت شمار ہوتی تھی۔"

یہ عبارت ۱۷۹۶ء میں لکھی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو ہماری زبان کا قدیم نام ہے جو شاہی فرود گاہ اور دربار سے تعلق کی بنا پر خود اہل ملک نے اُردو کو دیا اور جو اس وقت سے لے کر آج تک برابر استعمال ہو رہا ہے۔ ہندو اہل علم نے اسے "کھڑی بولی" کے نام سے یاد کیا اور اس کے مقابلے میں برج کو، جو اس وقت تک ہندی شاعری کی جان اور اس کی زبان سمجھی جاتی تھی، "پڑی" کہہ کر پکارا۔ للو جی لال اور سدل مصر ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ کھڑی بولی کا نام لیتے ہیں۔ للو لال لکھتے ہیں[4]:۔

۱۔ صفحہ ۲
۲۔ دستور الفصاحت صفحہ ۳ (مقدمہ)
۳۔ ہندوستانی زبان کی گرامر
۴۔ مقدمہ پریم ساگر۔

"عربی و فارسی الفاظ کو چھوڑ کر میں نے یہ کہانی دلی آگرے کی کھڑی بولی میں لکھی ہے"

سدل مصر کہتے ہیں[۲]:-

"کچھ لوگ ناسکیتو اپاکھیان کو سنسکرت میں ہونے کے باعث سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے کھڑی بولی میں میں نے اس کا ترجمہ کیا۔"

ڈاکٹر گلکرسٹ کھڑی بولی کے معنی ٹھیٹ ہندوستانی بتاتے ہیں[۳]:-

"ان میں بہت سی کہانیاں کھڑی بولی یا ہندوستانی کے خالص ہندوانہ اسلوب میں بیان کی گئی ہیں۔ کچھ برج بولی میں ہیں۔"

شیام سندر داس کی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو اہل علم نے اُردو کے قدیم روپ کو برج اور اودھی سے امتیاز کرنے کے لئے کھڑی کے نام سے یاد کیا[۴]:-

"۱۳۵۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان قدیم ہندی بولیوں نے دھیرے دھیرے برج اودھی اور کھڑی بولی کا روپ دھارا۔"

راما شنکر پرشاد لکھتے ہیں[۵]:-

"سدل مصر اور للولال نے برج بھاشا سے دلی کی کھڑی بولی میں قصے لکھے۔"

رام چندر شکل کھڑی بولی کی بابت فرماتے ہیں[۶]:-

"ان دنوں اور اس سے پہلے کھڑی بولی تعلیم یافتہ ہندوؤں کی مہذب زبان تھی جو دہلی سے پہاڑ تک کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔"

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی رائے اس بارے میں سب سے الگ ہے ان کے نزدیک[۷]:

"کھڑی بولی کے معنی گنواری بولی ہے جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ۔"

۱۔ مقدمہ ناسکیتو پاکھیان
۲۔ دی ہندی اسٹوری ٹیلر ج ۲ صفحہ ۴
۳۔ ہندی بھاشا کا وکاس صفحہ ۵۴
۴۔ ہندی ساہتیہ کا سنکشپت اتہاس صفحہ ۱۴۰
۵۔ ہندی بھاشا اور ساہتیہ صفحہ ۲۱۰
۶۔ اردو جولائی ۱۹۳۲ء صفحہ ۵۹۰

کھڑی کے دو معنی ہیں۔ اکھڑ اور کھردری۔ اُردو کو کھڑی اس لئے کہا گیا کہ برج کے میٹھے اور رسیلی بولیوں کے مقابلے میں اُردو کا لہجہ کچھا اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ مسلمانوں نے جب تک کھڑی کو منہ نہ لگایا ہندو برج اور اودھی ہی میں شاعری کرتے رہے۔[۱] کھڑی کے دوسرے معنی ہیں وہ بولی جس کے اسماء و افعال کے آخر میں "ا" ہو۔ اُردو کھڑی ہے اس لئے کہ اس کے اسماء و صفات "ا" پر ختم ہوتے ہیں۔ برج، قنوجی بندیلی اور اودھی پڑی ہیں۔ ان کے صفات و افعال کے آخر میں "و" یا "ے" و "ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بیلی کہتے ہیں[۲] کہ "بندیل کھنڈ میں کھڑی بولی ٹھاٹ بولی کہلاتی ہے اور مار واڑ میں ٹھاٹ بولی یا کھڑی بولی رائج الوقت یا چالو ہندوستانی زبان ہے۔ "یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اُردو کی قدیم شکل یعنی ہندوستانی کے سوا کھڑی کا اطلاق کبھی کسی اور زبان پر نہیں ہوا۔"

ہندوستانی کو ایک طرف برج سے امتیاز کے لئے کھڑی کہا گیا۔ برج اس زمانے میں بھاکا کہلاتی تھی۔ بھاکا یا بھاشا کے معنی ہیں زبان۔ ہر زبان بھاکا ہے لیکن جب یہ لفظ تنہا استعمال ہوا تو اس سے برج کی زبان مراد ہوئی۔ میرزا خاں فرماتے ہیں[۳]:-

"اطلاقِ آں سوائے سنسکرت و پراکرت عموماً شاملِ جمیع زبانہاست و خصوصاً زبان اہلِ برج بود۔"

شاہ حاتم فرماتے ہیں[۴]:-

"زبان ہر دیار تا بہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ۔"

انشاء اللہ خاں انشا رانی کیتکی کی کہانی کی ابتدائی سطروں میں لکھتے ہیں[۵]:-

"کوئی کہانی ایسی کہیئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے"

اس کے بعد اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ "ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا

---

[۱] زبان اہل برج الفصیح زبانہاست۔ و بر زبان اہل نظم و صاحب طبع اکثر جاریست (تحفۃ الہند صفحہ ۴۵)
[۲] بلیٹن اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز ج ۵ صفحہ ۳۶۴
[۳] تحفۃ الہند صفحہ ۵۴
[۴] دیوان زادہ مقدمہ۔
[۵] رانی کیتکی کہانی مقدمہ

پن بھی نہ ٹھنس جائے۔ جیسے پہلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جیوں
کا تیوں وہی ڈول رہے اور چھانہ کسی کی نہ پڑے"
"بھاکا پن سے انشا کی مراد ہے بھاشا کی پٹ ہے۔

اردو سے جو اس زمانے میں ہر شخص کی زبان پر تھا ہندوؤں کو بیر تھا۔ اُردو مسلمان کی
زبان سمجھی جاتی تھی اس میں عربی و فارسی الفاظ کی کثرت تھی یہ الفاظ دہلی کی زبان یعنی پرانے
قدیم یا کھڑی بولی میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے رائج نہ تھے۔ فارسی زبان کے اثر سے بعد میں
شامل ہوئے۔ ہندوؤں نے فارسی و عربی کے اس سرمایہ کو غیر ملکی قرار دیکر نکال باہر کیا اور
ہندوؤں کے لئے بول چال کی کھری زبان بنائی جس کا نام اوّل اوّل کھری (خالص) ہوا جو
بگڑ کر کھڑی بنا۔ کھڑا بھی فرخ آبادی کا "کھرا" بھی کھرا ہی کا بگاڑ ہے اس قیاس کی تائید
گلگرسٹ کے مندرجہ ذیل اقوال سے ہوتی ہے:-

(۱) اصلی کھڑی بولی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی بنیاد ہندوستانی گرامر پر ہے لیکن
اس میں سے عربی و فارسی الفاظ خارج کر دیئے گئے ہیں۔

(۲) کھڑی یا ہندوستان کی خالص اور نکھری ہوئی زبان میں شکنتلا کا یہ دوسرا ترجمہ
ہے۔ کھڑی بولی ہندوستانی سے صرف اس امر میں مختلف ہے کہ اس میں سے عربی و فارسی
الفاظ نکال دیئے گئے ہیں۔

ان سے دو باتیں معلوم ہوئیں اول یہ کہ کھڑی اُردو کی وہ شکل ہے جو مسلمانوں کی
آمد سے پہلے دہلی میں رائج تھی۔ دوسرے "کھڑی" اُردو کا قدیم نام نہیں۔ یہ نام اس کو بعد میں
اس وقت دیا گیا جب عربی و فارسی الفاظ نکال کر اسے شدھ (خالص) یا کھرا بنا لیا گیا۔
عربی یا فارسی الفاظ کی جگہ ٹھیٹ سنسکرت الفاظ نے لی تو اس کا نام ہندی (جدید ہندی
یا ہندوستان ہندی) ہوا جو پوری طرح اردو کے مقابلے کی زبان بنی۔ ہندوستانی ہندو اور

له جنرل اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز صفحہ ۳۶۷۔

مسلمان دونوں قوموں کی مشترک بول چال کی زبان تھی جس میں فارسی عربی الفاظ سنسکرت کے تدبھو لفظوں کے پہلو بہ پہلو بہے جاتے تھے۔ اردو اس زبان کا ادبی روپ ہے۔

ہندوؤں نے سنہ ۱۸۰۰ء کے قریب اول اول بول چال کی زبان ہندوستانی سے مسلمانی الفاظ نکال کر خالص ہندوانی بول چال کی زبان کا ڈول ڈالا اور اسے کھڑی (یا کھری) کہنا شروع کیا۔ بعد میں خالص سنسکرت (تت سم) الفاظ سے اس کا دامن بھر کر موجودہ ہندی بنائی جو اردو کے مقابلے کی ہندوانہ تہذیبی و ادبی زبان کہلائی۔ کھڑی اور ہندی دونوں میں ہندوانہ ذہنیت و عصبیت کارفرما ہے۔ دونوں پر خود ساختگی کی چھاپ ہے اس لئے ہندوستانی (اردو) کا نام کھڑی ہندوؤں تک محدود رہا اور مولوی عبدالحق کو یہ کہنا پڑا کہ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ۔ ہندوؤں میں بھی بقول ڈاکٹر بیلی یہ نام فروغ نہ پا سکا اور سدل مصر و للولال کے بعد ۱۸۴۷ء تک کسی ہندو عالم نے اردو کے اس نام کا ذکر نہیں کیا۔ راجا شیو پرشاد لکھتے ہیں۔[1]

"یہ پراکرت عربی و فارسی لفظوں کے سرمایہ سے مالامال ہے۔ اسے ہندی کہیں یا ہندوستانی یا بھاکا یا برج بھاکا یا ریختہ یا کھڑی بولی یا اردو یا اردوے معلیٰ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا تخم محمود غزنوی کے پیروؤں نے ڈالا۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"جب ڈاکٹر گلکرسٹ نے میرامن اور للو لال کوی سے نثر میں کتابیں لکھنے کو کہا تو وہ پریشان ہوئے یہ اُن کے لئے نیا تجربہ تھا۔ انھوں نے لکھا تو لیکن ایک خود ساختہ زبان میں۔ للو نے اپنی کتاب پریم ساگر میں فارسی و عربی زبان کے اجنبی لفظوں کو جگہ نہیں دی۔"

اردو کا تیسرا نام ہندوستانی یا ہندستانی ہے۔ یہ نام اردو کو اس وقت ملا

---

[1] ہندی انتخابات مقدمہ صفحات ۶، ۱۱

جب وہ صرف دہلی کی زبان نہ رہی مسلمانوں کے ہم رکاب ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچی اور برِ صغیر کے ہر صوبے میں تہذیبی و ادبی زبان کی حیثیت سے راج کرنے لگی۔ یوں تو شاہ جہاں (۱۶۲۷ — ۱۶۵۸ء) سے پہلے ہی اردو ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی تھی لیکن اردو کے لئے ہندوستانی کا استعمال شاہ جہاں کے عہد سے پہلے نہیں دیکھا گیا۔ عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامے میں اردو کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتا ہے اور برج کو ہندی کہتا ہے[1]۔

"سخن وران فارسی و ہندوستانی بہ نظم و نثر داستان آں رستم آثار بہ گذارند و دامن امید بجزائل عطایا برآموزند"

ملا وجہی سب رس (۱۶۳۵ء) میں اردو کو "زبانِ ہندوستان" لکھتے ہیں:-

"آغاز داستان بہ زبانِ ہندوستان"

مغربی مصنفین نے اردو کو زیادہ تر ہندوستانی ہی کہا۔ اس کے استعمال کی قدیم ترین تاریخ ڈاکٹر گریرسن سٹرلول (۱۶۱۶) کے حوالے سے ۱۶۱۶ء بتاتے ہیں[2]۔ ٹیری نام کو ہیٹ نامی شخص کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اندستان یعنی عوامی زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ فرایر کہتا ہے عدالت کی زبان فارسی ہے عام آدمی "اندستان" بولتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی تک مغربی مصنفین اردو کو ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے رہے۔ سب سے پہلے مشہور مستشرق کوبروکس نے اسے 'مورس' (مسلمانوں کی زبان) کہا۔ وہ ہندوستان سے اپنے والد کو خط لکھتا ہے اس میں کہتا ہے[3]۔

"ان میں ایک زبان جو بہت اہم ہے مورس ہے۔ یہ لکھی نہیں جاتی اس لئے میں اس پر پوری توجہ نہیں کر سکتا۔ دوسری فارسی ہے وہ اتنی خشک اور غیر دلچسپ ہے

[1] بادشاہ نامہ ج ۱ صفحہ ۲۹۲
[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۳
[3] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ج ۲۲ صفحہ ۵۰

کہ میری توجہ کو جذب نہیں کر سکتی۔"

اس کے بعد یہ نام عام ہو گیا۔ اور مغرب کے مصنف اُردو کو مورس کہنے لگے۔ گریرسن کے بیان کے مطابق اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستانی کو عام طور سے مورس کے نام سے یاد کیا جاتا تھا[1]۔

اُردو، کھڑی بولی، ہندوستانی، مورس ان چار ناموں میں سے 'مورس' مغربی مصنفین کا دیا ہوا ہے۔ برصغیر کے باشندوں نے اردو کو کبھی 'مورس' نہیں کہا۔ میں نے اوپر عرض کیا کہ ہندوؤں نے اُردو کی قدیم شکل کو کھڑی بولی کہا جو صرف بول چال میں کام آتی تھی اور اپنی کم مائیگی کے باعث اس قابل نہ تھی کہ اسے سنجیدہ علمی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جا سکے مغربی مصنفین میں سے گلکرسٹ نے اردو کو کھڑی کے نام سے یاد کیا۔ لیکن ان کا رجحان زیادہ تر ہندوستانی کی طرف رہا! وہ اردو کو ہندوستانی کے نام سے پکارتے رہے۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں:۔

"ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں نے اردو کو یہ نام (ہندوستانی) دیا ہے۔ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔" لیکن اس میں شاید ہی شبہ کیا جا سکے کہ اس نام کے رواج اور اس کی اشاعت میں مغربی مصنفین کا ہاتھ ہے۔

ڈاکٹر جولس بلاک اُردو کی بابت فرماتے ہیں۔ "میرا خیال کہتا ہے کہ اُردو کو یہ نام اہل مغرب کے نکتہ دانوں نے دیا۔ ڈاکٹر بیلی کو اس سے اتفاق نہیں وہ کہتے ہیں ڈاکٹر گلکرسٹ کے اس اقتباس سے جو اوپر دیا گیا ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس زبان کو اردو کہتے تھے۔ یہ نام ہندوستانیوں نے دیا۔ گلکرسٹ اسے ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے ہیں[2]۔

---

[1] جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۳

[2] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۹۳

مولانا شیرانی فرماتے ہیں: "اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔"
ڈاکٹر چیٹرجی کا ارشاد ہے: "اُردو کا نام ہندی (قدیم تر ہندوی) ہندوستانی اور اردو کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے[1]" "مسلمان عالموں نے سنسکرت اور پراکرت کو ہندی یا ہندوی یا زبان ہند کے نام سے یاد کیا ہے۔ البیرونی (۱۰۲۹ء) زبان ہند کی دو قسمیں بتاتے ہیں عوام کی زبان (اپ بھرنش پراکرت) اور خواص کی زبان جو کسی قدر پیچیدہ ہے اور جس میں اصول اشتقاق و تصریف و نکات بیان و بدیع کارفرما ہیں۔ امیر خسرو اس زبان ہند کی بابت فرماتے ہیں[2]۔

زبان ہند ہم تازی مثال است — کہ آمیزش درآنجا کم مجال است
گر آئین عرب نحو است و گر صرف — ازاں آئین دریں کم نیست یک حرف

ایلیٹ کی تاریخ میں ہے[3]۔

"جب اس عہد (اکبری) کا مسلمان لفظ ہندی استعمال کرے تو اس سے اشتباہ ہوتا ہے۔ نظام الدین کا بیان ہے کہ عبدالقادر بدایونی نے ہندی کی متعدد تصانیف کا ترجمہ کیا۔ ہم کو معلوم ہے عبدالقادر نے دوسری تصانیف کے علاوہ رامائن اور سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ بھی کیا ہے یہ کتابیں براہ راست سنسکرت سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ عبدالقادر اور فرشتہ دونوں لکھتے ہیں کہ مہابھارت کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اول الذکر اس کو نقیب خاں کی طرف منسوب کرتا ہے اور موخر الذکر فیضی کی طرف۔ یہاں ہندی سے سنسکرت مراد لی جا سکتی ہے —— ایک دوسری جگہ عبدالقادر کہتا ہے۔ اتھروید کا ہندی سے ترجمہ کرنے کو کہا گیا لیکن چونکہ اس کے الفاظ و معانی مشکل تھے

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۵۱
[2] دول رانی خضر خاں صفحہ ۳۴
[3] تاریخ ہندوستان جلد [illegible] صفحہ ۱۷۷۔

اس لئے اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی نے اس کام کو انجام دیا۔ یہاں ہندی سے سنسکرت کے سوا کوئی دوسری زبان مراد نہیں ہو سکتی۔
شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۱۴۹۶ء) اُردو کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ بولوں ہندی سب　　　　اِن ارتوں کے سبب
یو دیکھت ہندی بول　　　　پر معنی ہیں نپ تول

اِن کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) ارشادنامے میں فرماتے ہیں:-

عیب نہ راکھے ہندی بول

جعفر زٹلی (متوفی ۱۷۱۲ء) بھی اسے ہندی ہی کہتے ہیں۔

اگرچہ سبھی کوڑہ وکرکٹ است　　　　بہ ہندی ونعدی زبان اشپٹ است

فضلی نے دہ مجلس (۱۷۳۲ء) میں اور افضل بیگ نے تحفۃ الشعراء (۱۷۵۲ء) میں اُردو کو ہندی ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ میر اثر مثنوی خواب وخیال میں ہندوی لکھتے ہیں:-

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں　　　　باقی اشعار مثنوی سو ہیں

ہندی اور ہندوی ایک لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ پہلا ہند کی طرف منسوب ہے دوسرا ہندو کی طرف۔ ان الفاظ کا اطلاق عام طور سے ہر خطے اور علاقے کی بول چال کی زبان پر ہوا۔ برصغیر پاک وہند کی ہر مقامی وعلاقائی زبان کو مسلمانوں نے ہندی یا ہندوی کے نام سے یاد کیا۔ عبدالحمید لاہوری نے برج کو ہندی کہا اور شاہ حاتم نے ہندوی:-

"زبانِ ہر دیار تا ہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ"

ان علاقائی زبانوں میں عربی وفارسی الفاظ کی آمیزش نہ تھی اس لئے اردو کی قدیم

شکل "ہندی" کے نام سے موسوم ہوئی اور بالآخر ٹھیٹ اردو جس میں عربی و فارسی الفاظ کی ملاوٹ نہ ہو ہندی یا ہندوی کہلائی، انشاء لکھتے ہیں :۔

"ہندوی پھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے"

اس کے مقابلے میں عام فہم بول چال کی مخلوط زبان کو اُردو کہا گیا اور نظم کی جاری بحر کو نصف فارسی اور نصف ہندی زبان کو ریختہ۔ مولانا شاہ عبدالقادر ترجمہ قرآن شریف (۱۲۰۵ھ) میں فرماتے ہیں :۔

"اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف کہ عوام کو بھی بے تکلف دریافت ہو"

اُردو بول چال تک محدود رہا۔ آپس کی بات چیت میں لوگ اُردو کو اُردو پکارتے رہے۔ کولبروک کے زمانے تک اُردو میں تصنیف و تالیف کا آغاز نہیں ہوا تھا اس لئے اس نے اپنے والد کے نام اس خط میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا اردو کو مورس کہا اور اس کی بابت لکھا کہ وہ تحریر میں نہیں آتی۔ اُردو میں ادب کی ابتدا شعر سے ہوئی اور شعر کی غزل سے۔ امیر خسرو (۱۳۲۵ء) نے سب سے پہلے فارسی آمیز اردو غزل کہی جس کا نام ریختہ پڑا۔ پھر اس تعلق سے اس زبان کو ریختہ کہا گیا جو غزل کے لئے مخصوص ہو چکی تھی سعدی کاکوروی کہتے ہیں۔

سعدی بگفتہ ریختہ در ریختہ — شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

شاہ مبارک آبرو فرماتے ہیں :۔

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے — ان سیتی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے

جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف — لغو ہیں گے فعل اس کے ریختے میں حرف ہے

میر نے فارسی کی آمیزش کا تناسب ملحوظ رکھ کر ریختہ کی جو قسمیں کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریختہ اُردو کا علم نام نہ تھا۔ شعرا اس کو ریختہ کہتے تھے۔ دوسرے وہ نظم

کی مخصوص اور کسی قدر خود ساختہ زبان تھی۔ بول چال کی فطری زبان عام طور سے اُردو کہلاتی تھی۔ ڈاکٹر بیلی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۱ :

"اردو کو بات چیت میں اردو زبان اُسی وقت سے کہا جاتا رہا جب سے لشکر گاہ اردو کہلائی یہ نام کئی سو سال بعد کتابوں اور تحریروں تک پہنچا۔ اور اس تاریخ سے پہلے پہنچا جب وہ ہمیں کتابوں میں ملا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تنہا لفظ "اردو" زبان کے معنی میں اس زمانے سے کسی قدر بعد کی پیداوار ہے"

دہلی کی زبان ہونے کے باعث امیر خسرو، ابوالفضل اور شیخ بہاالدین باجن نے اُردو کو زبان دہلوی کہا۔ دیوان زادہ کے مقدمے میں روزمرۂ دہلی سے شاہ حاتم (متوفی ۱۷۹۱ء) کی مراد اردو زبان ہے :۔

"روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویان رند در محاورہ آنند منظور داشتہ"

اس کے بعد فرماتے ہیں :۔

"زبان ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار کردہ"

حکیم اسد علی یکتا لکھتے ہیں۲ :۔

"نام ہمیں محاورۂ خاص باردوے معلیٰ شہرت گرفت۔ لیکن ایں زبان با شروط مذکورہ یافتہ نمی شود مگر در بعضے باشندہ ہائے شاہ جہاں آباد"

اُردو ہجرت کر کے گجرات و دکن پہنچی تو گجرات میں گجری کہلائی اور دکن میں دکھنی۔ شاہ برھان الدین جانم فرماتے ہیں۔

جے ہوئے گیان بچاری   نہ دیکھے بھاکا گوجری   (حجۃ البقا)

۱؎ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۹۶

۲؎ دستور الفصاحت صفحہ ۵ (مقدمہ)

یہ سب کیا گجری زبان

رستمی (۱۶۴۹ء) خاور نامہ میں لکھتے ہیں:۔

خاور نامہ دکنی کیتا ہوں نام

شاہ ملک (۱۶۶۷ء) فرماتے ہیں :۔

دکنی میں بر لیا ہے صاف (شریعت نامہ)

ان اقتباسات میں گجری سے گجراتی اُردو مراد ہے اور دکنی سے دکنی اردو۔ دکن و گجرات کے شعرا اور اہلِ قلم کو جب اس کا احساس ہوا کہ دکن و گجرات کی اردو شمالی ہند کی اردو سے مختلف ہے تو انہوں نے اپنی زبان کو گجری یا دکنی کہا اور شمالی ہند کی اردو کو ہندی یا ہندوستانی۔ۃ اس سے پہلے جب انہیں اس کا احساس نہ تھا وہ اپنی زبان کو ہندی ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ چندر بدن و مہیار کا قصہ دکن کے جن شعرا نے نظم کیا ہے ان میں ایک شاعر بُلبل ہے۔ وہ اپنی نظم کی بابت کہتا ہے :۔

حریرِ ہندوی پر کر تو تحریر   لباسِ پارسی ہے پائے زنجیر

اس کی یہ نظم دکھنی زبان میں ہے۔ چندہ حسینی واقف بیجا پوری شاعر ہے۔ اس نے اس قصے کو نظم کرنا چاہا تو اپنے عجز کا اظہار ان الفاظ میں کیا:۔

مقیمی نے مگر دکنی زباں میں   لکھے ہیں قصہ اک ان کے بیاں میں
لکھا ہے فارسی کوئی رسالہ   یہ سب قصہ کہا ہے اس میں حوالہ
اگرچہ میں بھی تو اہلِ دکن ہوں   نہیں کچھ ہند کا صاحب سخن ہوں
تتبع فارسی کا میں کیا ہوں   حکایت ہر دو قصوں سے لیا ہوں

ۃ۔ بہت ممکن ہے کہ یہ نام (ہندوستانی) دکن ہی میں اردو کو ملا۔ تاکہ شمالی ہند کی زبان ہندوستانی جنوبی ہند کی ہندی [illegible] دکھنی سے ممتاز ہو سکے (انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۰۸)

کہتا ہے "یہ قصہ فارسی میں آتشی نے نظم کیا اور مقیمی نے دکھنی اُردو میں ہر چند میں دکن کا باشندہ ہوں اور میرے لئے ہندِ شمالی ہند کی زبان ہندی (ہندوستانی) میں کچھ لکھنا دشوار ہے تاہم کوشش کی ہے کہ اس نظم کو محاورۂ ہند یعنی شمالی ہندوستان کی زبان میں قلم بند کروں۔"

اُردو قدیم زبان ہے مسلمانوں کی ہند میں آمد سے پہلے بھی وہ دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس کا قدیم نام کیا تھا یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کو اُردو مسلمانوں کی آمد کے بعد کہا گیا اور اس لئے کہا گیا کہ اس نے دہلی کی شاہی فرودگاہ میں جسے اُردوئے معلیٰ کہا جاتا تھا، نیا جنم لیا۔ اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ عربی و فارسی الفاظ کے ذخیرے سے مالا مال ہو کر تہی دامنی کے بعد وہ ادبی زبان کے منصب پہ فائز ہوئی اُردو کی نشاۃِ ثانیہ اور حیاتِ نو کا آئینہ دار اس کا نام اُردو ہے اس کو اس کے دوسرے ناموں سے جو حیاتِ نو کے بعد اسے دیئے گئے قدیم ہونا چاہیئے کسی قدیم تاریخ میں نہ ملنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُردو کا نام اردو قدیم نہیں حال کی پیداوار ہے۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر جوس بلاک کی رائے ہے کہ اردو ہماری زبان کا قدیم نام ہے۔ وہ فرماتے ہیں[1]:-

"اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اُردو زبان (یہ اس کا قدیم نام ہے) کس طرح ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچی"

---

[1] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۵ صفحہ ۷۳۹۔

(۲)

"لِسانی سرمایہ"

اُردو کا آغاز کب اور کس جگہ ہوا اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ اُردو سے ہماری کیا مراد ہے۔ وہ کون سی زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں؟ اس میں کئی فائدے ہیں: ایک تو آگے چل کر غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔ اردو سے ملتی جلتی اور بھی کئی زبانیں ہیں جو آج اردو کے پڑوس میں دائیں بائیں آگے پیچھے بولی جاتی ہیں۔ ایک جستجو کرنے والا ان زبانوں کو اردو سمجھ کر اُردو میں شامل کر سکتا ہے اور ان کی خصوصیات اصل سوال کے طے کرنے میں سدِ راہ بن سکتی ہیں۔ اس لئے زیادہ اچھا ہے کہ شروع ہی میں طے کر لیا جائے کہ ہم کس زبان کا آغاز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کونسی خصوصیات ہیں جن کے ماخذ کا کھوج لگانے کی ہمیں فکر ہے۔ دوسرے علم و دریافت کا صحیح اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ معلوم سے نامعلوم کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ جو بات آج صحیح اور قطعی طور سے ہمیں معلوم ہے اسے بنیاد ٹھہرا کر اُسے دریافت کیا جائے جسے ہم نہیں جانتے۔ جلم

کی روشنی سے وجعلی کی تاریکی میں ہم قدم رکھ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے سفر کا آغاز تاریکی کے کسی نقطے سے نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاتھ میں شمع لے کر روشنی سے تاریکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا چاہیئے۔ تاکہ ہم بھٹک نہ جائیں اور جیسے جیسے تاریکی دور ہوتی جائے ہم آگے قدم بڑھاتے چلے جائیں اس طرح یقیناً ہم منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

آج جسے اردو کہا جاتا ہے اس کے خط و خال، رنگ و آہنگ کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم اس زبان کو نہیں جانتے جس سے اردو نے جنم لیا۔ اُردو کے موجودہ نقش و نگار کا ہمیں علم ہے لیکن اس کے پرانے رنگ و آہنگ سے ہم ناواقف ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے اردو اپنے پورے نکھار سنگھار کے ساتھ دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ علم نہیں کہ اِس زبان کا آغاز انہی اضلاع میں ہوا یا کسی اور مقام میں جہاں سے اسے دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں لایا گیا۔ ان میں سے جو باتیں ہمیں معلوم ہیں ان کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ ثابت شدہ حقیقتیں ہیں۔ جو چیزیں ہم نہیں جانتے انہیں جانی ہوئی چیزوں کی روشنی میں جتنا چاہیئے کوئی بات فرض کر کے اس کے مطابق ثابت شدہ حقیقت کو توڑنا مروڑنا مناسب نہیں۔ اس کے برعکس ثابت شدہ حقیقتوں کے مطابق اور ان کے قیاس پر اپنے مفروضات کو ڈھالنا ہمارا فرض ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ کوئی ایسی بات فرض نہ کریں جو موجودہ معلومات اور ثابت شدہ حقائق کے خلاف ہو۔

اُردو آج ہم اس زبان کو کہتے ہیں جو دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ عالم، عامی، بچے، بوڑھے، مرد عورت سبھی کی زبان ہے یہ زبان مشرقی یوپی، بہار، پنجاب، سی پی اور دکن کے شہروں میں بھی رائج ہے لیکن اپنے خاص نکھار کے ساتھ یہ صرف تعلیم یافتہ طبقے میں بولی جاتی ہے۔ دہلی اور یوپی

کے مغربی اضلاع میں یہ بول چال کی زبان بھی ہے اور ادب و شعر کی زبان بھی مگر دوسرے مقامات میں (چند بڑے بڑے شہروں کو چھوڑ کر) اس کو ادبی، تحریری یا تہذیبی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ بول چال کی زبانیں اور ہیں۔

ہر زبان کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے زبان تشکیل پاتی ہے یہ خصوصیات مجموعی طور سے صرف اس زبان میں ہوتی ہیں۔ الگ الگ ان میں کی ہر خصوصیت، ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری زبان میں بھی ہو لیکن مل ملا کر یہ خصوصیات صرف اسی زبان میں ہو سکتی ہیں۔ ہم زبان کو اس کی خصوصیات سے جانتے ہیں اور دوسری زبانوں سے اس کو ممتاز اور مختلف زبان ان خصوصیات ہی کی وجہ سے سمجھتے ہیں۔ کسی دو زبانوں میں فرق و امتیاز ان کی خصوصیات سے کیا جاتا ہے ورنہ ایک خاندان کی زبانوں میں مشترک صفات بھی ہوتی ہیں جو اس خاندان کے تمام افراد میں پائی جاتی ہیں۔ اردو کا آغاز کب ہوا؟ بظاہر یہ سوال بے معنی ہے۔ اردو دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے جو نامعلوم زمانے سے ترقی کرتی آئی ہے۔ اس کا آغاز کیا؟ ہاں! یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اردو نے اپنا موجودہ روپ کب اختیار کیا۔ اردو جو غیر معلوم زمانے سے ترقی کرتی، اور رنگ بدلتی آئی ہے اس میں موجودہ رنگ کب آیا؟ اس سے پہلے اس کی شکل کیا تھی؟ موجودہ رنگ عبارت ہے اس کے لفظی، صوتی، صرفی، نحوی سرمایہ سے جس میں اردو کی خصوصیات بھی شامل ہیں اور مشترک صفات بھی یعنی اردو زبان کے وہ الفاظ، آوازیں (ما دے) اور صرفی نحوی قاعدے بھی ہیں جو اردو کے ہیں اور صرف اردو کے ہیں اور وہ بھی جو اردو اور اس کی پاس پڑوس کی زبانوں کے مابین مشترک ہیں۔ مثلاً وہ کرتا ہے، میں "وہ" اور "تا" اردو کے ساتھ خاص ہیں اور "کر" اور "ہے" اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی ہیں ("ہے" "ہے" کی صورت میں)

اُردو کی موجودہ شکل متعین کرنے سے پہلے اردو کا لسانی تجزیہ ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اُردو کی خصوصیات کیا ہیں اور وہ کون سی صفات ہیں جو اردو اور ہندوستان کی دوسری بولیوں میں مشترک ہیں۔ یوں تو اردو مجموعہ ہے اپنی خصوصیات اور مشترک صفات کا لیکن اصل میں اردو اس کی خصوصیات کا نام ہے۔ اردو کے آغاز کا مسئلہ اُردو کی خصوصیات کے آغاز کا مسئلہ ہے۔ اردو کی خصوصیات اس کے خط و خال ہیں جب تک اُردو کے خط و خال نہیں ابھرے، اُردو وجود میں نہیں آئی اور اس میں اپنی ہم رشتہ اور عزیز بولیوں سے الگ منفرد اور مستقل بولی کا رنگ نہیں جھلکا۔ درخت کا تنا ایک ہوتا ہے جو کچھ عرصے تک ایک رہتا ہے اس کے بعد اس میں دائیں بائیں بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں جو تنے سے رنگ روپ میں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک شاخ کو لے کر ہم پوچھیں کہ یہ کب پیدا ہوئی تو ہر صاحب شعور اس کا آغاز اس مقام سے بتلائے گا جہاں شاخ تنے سے جدا ہوئی۔ شاخ تنے سے کب جدا ہوئی یہ بتانا آسان ہے۔ یہ نظر کا کام ہے شاخ ہر ناظر کو تنے سے پھوٹتی اور نکلتی نظر آتی ہے۔ وہ انگلی رکھ کر بتا سکتا ہے۔ کہ یہاں سے شاخ نے جنم لیا لیکن زبان کا حال ذرا اس سے مختلف ہے۔ اس کے تنے یعنی اصل کا پتہ لگانا اتنا آسان نہیں۔ یہاں نظر کے ساتھ خبر کی ضرورت بھی ہے بصر کے ساتھ بصیرت بھی چاہیئے۔ درخت کو جڑ کی طرف سے دیکھیے یا پھننگ کی طرف سے نقطۂ اتصال و انفصال صاف نظر آجاتا ہے۔ نیچے سے دیکھیے تو پہلے تنے پر نظر پڑتی ہے اس کے بعد نقطۂ انفصال سامنے آتا ہے یعنی وہ مقام جہاں سے شاخیں پھوٹیں اور دائیں بائیں پھیلیں۔ اوپر سے دیکھیے تو پہلے گھنی چھتنار شاخیں ہاتھ پھیلائے نظر آتی ہیں اس کے بعد وہ مقام آتا ہے جہاں سمٹ کر یہ ایک ہوئیں۔ لیکن زبان میں جو پہیلی ڈب ہے وہ کچھ اور طرح کا ہے۔ اسے سمجھنے اور جاننے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ ملتی جلتی بولیوں کا ساتھ ساتھ تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ان

میں جو صفات مشترک ہوں انہیں الگ کرلیا جائے یہ ان ملتی جلتی اور باہم متشابہ بولیوں کا منبع یعنی اصل ہوں گی۔ ان کے علاوہ جو خصوصیات بچیں انہیں اس اصل کی مختلف شاخیں یعنی بھانت بھانت کی بولیاں سمجھیے۔

اُردو کا تمام تر سرمایہ یہ ہے ۔

(۱) مفرد الفاظ جو دو قسم کے ہیں۔ کچھ عربی فارسی وغیرہ زبانوں سے لے گئے ہیں جنہیں ہم دخیل کہتے ہیں۔ کچھ اس قدیم زبان کے ہیں جس سے اُردو نے ارتقا پایا۔ یہ دو طرح کے ہیں ۔

(الف) تدبھو۔ وہ الفاظ جو اپنی اصل سے کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں اُردو میں استعمال ہوتے ہیں جیسے اچنبھا، کھیں وغیرہ

(ب) تت سم۔ جدید الفاظ جو جوں کے توں اُردو میں مستعمل ہیں۔ اُردو نے اپنے مزاج کے مطابق ان میں کوئی تصرف نہیں کیا۔ جیسے راجا، پرجا وغیرہ ۔

(۲) مرکب الفاظ۔ یہ بھی دو طرح کے ہیں (الف) غیر زبان کے مرکبات جیسے بے ایمان، دل پسند وغیرہ (ب) اُردو مرکبات جیسے اَٹکل پچّو، آپا دھاپی ۔

(۳) بنیادی الفاظ یعنی مادے جن سے اسماء، افعال اور اس کے مشتقات وضع ہوتے ہیں۔ جیسے۔ کر۔ اٹھ۔ بیٹھ۔ پڑھ۔ لکھ وغیرہ ۔

(۴) تعمیری کلمے، ان کے سہارے مادّوں سے افعال اور مشتقات وضع کیے جاتے ہیں۔ جیسے۔ 'نا' 'تا'۔ 'گا' وغیرہ کرنا، کرتا، کرے گا، میں۔

(۵) حرف رابطہ انھیں حروف معنوی، حروف مغیرہ یا اعرابی لاحقے بھی کہتے ہیں۔ ان کی مدد سے اسم کو گردانا جاتا ہے سے، پر، میں، تک، کا، کو ان میں سے چند ہیں۔

(۶) ضمیریں، اسمائے موصولہ، کنایات وغیرہ جیسے۔ وہ۔ جو۔ کتنا۔ کیسا۔ وغیرہ

(۷) صرفی نحوی اصول اور قاعدے جو اسما و افعال کے بنانے، گردانے اور الفاظ کی صحیح ترکیب و ترتیب میں کام آتے ہیں مثلاً الف پر ختم ہونے والے مذکر اسما، ضمائر اور موصولات کا غیر فاعلی حالت میں بدل جانا۔ جیسے گھوڑے کی گھاس اُس جس۔ کس۔ وغیرہ۔

اُردو کے ترکیبی اجزا جن سے اردو بنی ہے ہیں۔ یہ سب ایک حیثیت کے نہیں ان میں سے کچھ اہم ہیں اور کچھ غیر اہم۔ غیر اہم وہ ہیں جو زبان کی تعمیر و تشکیل میں دخیل نہیں یعنی وہ الفاظ جو کسی اجنبی زبان سے اردو میں درآمد کئے گئے اور اردو کے اپنے الفاظ جو قریبی زمانے میں اُردو میں داخل ہوئے اس لئے رچ بچ کر اردو نہیں بن سکے یعنی دخیل اور سنسکرت کے تت سم الفاظ لسانی طور پر غیر اہم ہیں۔ زبان کے مزاج اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں ان الفاظ کو دخل نہیں۔ ان کو زبان کے اصلی سرمایہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الفاظ اتنے پرانے نہیں جتنی پرانی زبان ہے۔ ان کی تاریخ میں وہ کہانی نہیں جو زبان کی تاریخ میں ہے۔ ایک اجنبی کی طرح یہ الفاظ زبان میں چپکے سے آئے اور بس گئے۔ زبان کی تاریخ ان کی تاریخ سے الگ ہے۔ زبان کو اپنی زندگی کے جن دوروں سے گزرنا پڑا یہ الفاظ ان دوروں سے نہیں گزرے۔ وہ زبان کے غیر شہری باشندے ہیں اس لئے زبان کے آغاز و نشوونما کے سلسلے میں ان کا ذکر نہیں آسکتا یا کم سے کم نشوونما کے ابتدائی مراحل میں ان کا ذکر نہ ہونا چاہیئے۔ زبان کے بہت سے ارتقائی منازل ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سی کروٹیں بدلیں۔ اس سفر میں اس کے سامنے بہت سے موڑ آئے دخیل اور تت سم الفاظ ان منزلوں، کروٹوں اور موڑوں میں سے کسی ایک موقع پر زبان میں داخل ہوئے اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو۔ اس لئے جب یہ موقع آئے تو ان الفاظ کا ذکر کیا جائے۔ بے محل اور موقع بیان کو لے بیٹھنا مناسب نہیں۔ پروفیسر میکس مولر کہتے

ہیں کہ زبانوں کی تقسیم اور ان کے رشتوں اور قرابتوں کی تعیین ان کی صرفی نحوی ساخت کے مطابق کی جاتی ہے۔ فرہنگ الفاظ کی اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں ہے[1]۔

زبانیں ایک طرح کی نہیں ہر زبان کی قواعدی ساخت دوسری زبان سے مختلف ہے۔ زبانوں کے رشتے ان کی ساخت سے معلوم کیے جاتے ہیں اور ان دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو ایک رشتۂ قرابت میں پرویا جاتا ہے جن کی ساخت ایک جیسی ہے، جن کے بنیادی اور تعمیری الفاظ ایک جیسے ہیں۔ حروف ربط جن کے ملتے جلتے ہیں، جن کے صرفی و نحوی قاعدوں میں یکسانی کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان کی ساخت میں صرف یہی تین چیزیں شامل ہیں۔ زبان اصل میں انہیں تین چیزوں کا نام ہے جن سے اس کا رنگ نکھرتا ہے شکل و صورت بنتی ہے اور وہ ایک مستقل اور منفرد شخصیت حاصل کرکے ایک آزاد زبان کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ دخیل الفاظ زبان کی ساخت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ان کی مدد سے زبان کے تعمیری دور روشنی میں نہیں آتے۔ ایک قوم کے سیاسی تغلب کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے جس کے زیر اثر یہ بدیسی الفاظ زبان میں داخل ہوتے ہیں۔ اردو میں فارسی عربی الفاظ کی بھرمار ہے اگر ہم اپنی تحقیق و جستجو کی عمارت ان لفظوں پر کھڑی کریں تو اس سے دو نتیجے برآمد ہوں گے۔ ایک یہ کہ اردو عربی یا ایرانی خاندان کی زبان ہے دوسرے اس کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب مسلمان ہندوستان آئے۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ مسلمانوں نے فارسی عربی الفاظ کی آمیزش کے بعد اردو زبان کا کالبد تیار کیا۔ یہ دونوں نتیجے غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن ہیں۔

پاس پڑوس کی بولیوں میں سے اردو، ہریانی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی سے بہت مشابہ ہے ان کے الفاظ کا بیشتر سرمایہ ایک جیسا ہے صرفی نحوی قاعدوں

---

[1] ملاحظہ فرمائیے سائنس آف لینگویج دوسرا لیکچر صفحات ۹۰، ۸۶ (اشاعت ششم)

میں بڑی حد تک یکسانی ہے اس کے علاوہ پنجابی، راجستھانی، اودھی سے بھی اردو بہت کچھ ملتی ہے۔ اردو کو ان بولیوں اور زبانوں سے جن لفظی، صوتی، صرفی اصول و سرمایہ کی بنا پر مستقل و مختلف زبان سمجھا جاتا ہے وہ اردو کی لسانی خصوصیات ہیں ان خصوصیات کا علم بہت ضروری ہے۔ اردو کے آغاز کی دریافت کے لئے بھی اور زبان و ادب کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے بھی علم طور سے اردو کے حسب و نسب سے بحث کرنے والوں سے بھول ہوئی کہ اردو کی خصوصیات متعین کئے بغیر انہوں نے اُردو کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کا کھوج لگانا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کا آغاز اس وقت مان لیا گیا جب اردو نہ تھی اور اس مقام سے مان لیا گیا جہاں اردو کا تخم نہیں ڈالا گیا تھا۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اُردو کی حسب ذیل خصوصیات شمار کرائی ہیں۔[1]

(۱) کا ۔ کی — اضافت کے لئے جیسے:۔ — حامد کا گھوڑا ۔ محمود کی کتاب

(۲) سے — علامت مجرو آلہ جیسے:۔ — لاٹھی سے مارا ۔ گھر سے روانہ ہوا

(۳) میں ۔ پر — ظروف کے لئے جیسے:۔ — گھر میں ۔ کوٹھے پر

(۴) نا — علامت مصدر جیسے:۔ — کرنا ۔ پڑھنا

(۵) تا — علامت حالیہ ناتمام و فعل حال جیسے:۔ — چلتا پھرتا ۔ وہ دوڑتا ہے

(۶) "ا ۔ یا" — علامت حالیہ تمام و فعل ماضی جیسے:۔ — کھلا (کھلا ہوا) ۔ چلا ۔ رہا وغیرہ

(۷) گا — علامت استقبال جیسے:۔ — جائے گا ۔ پڑھے گا۔

(۸) س — اسماء عامہ میں غیر فاعلی حالت کی علامت جیسے:۔ — اس (وہ) ۔ جس (جو)، کس (کون) ۔ اس (یہ)

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۵۴۔

ان میں ذیل کی خصوصیات کا اور اضافہ کیجیے:۔

(۹)	کو	علامت مفعول	حامد نے محمود کو مارا
(۱۰)	نے	علامت فاعل	
(۱۱)	تک	علامت جر	گھر تک
(۱۲)	"ـوں"	اسماء مطلقہ میں غیر فاعلی حالت کی علامت جمع	بچوں نے لڑکے کو مارا۔

اُردو کا لسانی سرمایہ ذیل کے تین اجزا پر مشتمل ہے:۔

(الف)۔ مفرد الفاظ جن میں اسماء و صفات دونوں شامل ہیں۔ جیسے گھوڑا۔ بچہ۔ اچھا۔ بُرا۔

(ب) افعال و حروف۔ افعال میں تمام بنیادی الفاظ آ گئے اور حروف میں تمام معنوی اور تعمیری حروف۔

(ج) اصول صرف و نحو۔

ان میں سے مفرد الفاظ کا جو دوسری زبانوں سے اُردو میں لے لیئے گئے ہیں اُردو کے ماخذ اور اس کے آغاز سے کوئی تعلق نہیں اس لیئے ان کا ذکر اس سلسلے میں نہ ہونا چاہیئے۔ باقی جو کچھ بچا سب اُردو کا ہے اُردو اگر جسم ہے تو یہ اس کا گوشت پوست ہیں۔ اردو جیسے ہے اُردو کا یہ سرمایہ بھی اسی وقت سے ہے اردو کا آغاز اس کا آغاز ہے اور اردو کا ارتقا اس کا ارتقا۔ اردو لفظوں اور آوازوں کے اس سرمایہ کے سوا کوئی چیز نہیں۔ لیکن اس میں جو چیز خاص اردو کی ہے، جس سے اس کی ہیئت بنتی ہے اور جس سے اس کی شخصیت و انفرادیت کا قیام و بقا ہے وہ اس کی خصوصیات ہیں جب سے اُردو میں یہ خصوصیات پیدا ہوئیں اُس نے دوسری بولیوں سے الگ ایک زبان یا بولی کی حیثیت حاصل کی اس سے پہلے اُردو دوسری بولیوں سے ممتاز نہ تھی اس میں اور دوسری بولیوں

میں خط فاصل نہیں کھینچا جا سکتا تھا۔ ان خصوصیات کا اُبھرنا اور نمایاں ہونا اردو کی ابتدا یا اس کا آغاز ہے۔

یہاں دو ایک غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے جو بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اس طرح جم کر بیٹھ گئی ہیں کہ نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ ایک غلط فہمی جسے میں سب سے زیادہ خطرناک اور لسانی بحثوں میں حقیقت سے بھٹکانے والی سمجھتا ہوں یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو جوڑ کر کوئی تیسری نئی زبان وضع کی جا سکتی ہے جو پہلی دو زبانوں سے جُدا اور آزاد ہو۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کی آمیزش سے ایک نیا اور دونوں سے مختلف رنگ ضرور تیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دو زبانوں کی ترکیب سے کسی تیسری نئی زبان کی تعمیر ناممکن ہے۔ زبان نامی اور ذی حیات چیز ہے جو دوسری نامی چیزوں کی طرح مسلسل تغیر و ارتقا کے زیر اثر وجود میں آتی ہے۔ پاس پڑوس کی زبانوں سے غذا حاصل کر کے ان کی فضا میں سانس لے کر وہ فربہ اور توانا تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ مل کر کسی تیسری زبان کو جنم دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک زبان کسی ایک مخصوص و محدود علاقے میں مدتوں بولی جاتی رہی، زمانے کے ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوئیں۔ کچھ عرصے کے بعد کسی مجبوری سے مثلاً کثرتِ آبادی کے باعث یا باہمی آویزش کی وجہ سے یا غذا کی تلاش میں اس زبان کے بولنے والوں میں بہت سے لوگ ترکِ وطن کر کے دوسرے مقامات پر جا بسے اور ایک دوسرے سے اتنی دور ہو گئے کہ ان میں میل ملاپ اور ارتباط کے مواقع نہ رہے۔ جُدائی کے وقت یہ لوگ ایک زبان بولتے تھے جو سب کے لئے قابلِ فہم تھی۔ جُدائی کے بعد حسب قاعدہ ان کی زبان بدلنا شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ اتنی بدل گئی کہ وہ اپنی اصل سے دور جا پڑی۔ ادھر اصل زبان بھی ناموسِ ارتقا کے زیر اثر برابر متغیر ہوتی رہی تھی۔ اصل اور فرع کی تبدیلیاں ایک کو دوسری سے دور لے گئیں یہاں تک کہ اصل فرع سے اور

ایک فرع دوسری فرع سے بچھڑتے بچھڑتے بالکل اجنبی بن گئیں اور چند بنیادی ناقابل تغیر عناصر کے سوا ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہ رہی۔ صرف یہی ایک صورت زبان میں تنوع کی ہے جس سے زبان کی متعدد سی شاخیں اور کونپلیں پھوٹتی ہیں جو اس زبان کی بولیاں کہلاتی ہیں۔ زبان اصل ہوتی ہے اور بولیاں اس کی شاخیں۔ زبان سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے اور بولیاں چھوٹی چھوٹی نالیوں یا جدولوں کی طرح ادھر ادھر پھیلتی جاتی ہیں۔ یہ سب بولیاں ایک حیثیت کی نہیں ہوتیں جو بولی اصل زبان یا اپنی ہمسر شاخ سے مکانی طور پر قریب ہوتی ہے وہ لسانی طور پر اس سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے جو دور ہوتی ہے وہ لسانی سرمایہ کے لحاظ سے بھی دور ہو جاتی ہے۔ ایم ایڈمنڈس نے زبان کے تنوع کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے۔ فرض کیجیے الف مرکزی زبان ہے۔ ب۔ ج۔ د اس کی شاخیں ہیں جو ایک ہی رخ پھیلتی چلی گئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں 'الف' اور 'ب' میں باہمی ارتباط کے مواقع الف۔ ج اور الف۔ د کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ اسی طرح ب۔ ج میں جو ایک اصل کی دو شاخیں ہیں مشترک عناصر ب۔ د کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ ب۔ ج کا مشترک سرمایہ ہو سکتا ہے اتنا ہی ہو جتنا ج۔ د کا ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ وہی ہو جو ج۔ د کے مابین مشترک ہے۔ 'الف' اور 'د' ہر چند ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ لیکن ب۔ ج نے ان کے درمیان رابطہ قائم کر کے اس مکانی فاصلے کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے جب تک ب۔ ج اپنی جگہ ہیں۔ اس کا امکان کم ہے کہ ا۔ د بچھڑیں اور ایک دوسرے کے لیے قابل فہم نہ رہیں۔ لیکن 'ب' اور 'ج' کے درمیان سے ہٹ جانے کے بعد 'الف' اور 'د' ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن سکتے ہیں[1]۔

زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ زبان زبان کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کا یہ سمجھنا اگر غلط ہے کہ زبان آپ ہی آپ پیدا ہوتی تو

---

[1] مقدمہ تقابلی سانیات مجمع ایم ایڈمنڈس صفحہ ۱

کسی ایک زبان کے موجودہ روپ کو لے کر یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ قدیم ترین زبان ہے زبان کا آغاز جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اس کے موجودہ خط و خال کا ابھرنا اور نمایاں ہونا ہے کہ وہ اپنی اصل سے ممتاز ہو جائے اور اس میں اور اس کی ہمسر بولیوں میں فرق کیا جا سکے۔ اگرچہ اس ابھار اور نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی لیکن ہر زبان کی زندگی میں ایک ایسا دور آتا ہے جب اس کے خط و خال اور اس کی امتیازی خصوصیات ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں ہم اس دور کو اپنی زبان کا یوم میلاد قرار دے سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان کا آغاز اس عہد کے لگ بھگ ہوا۔ زبان کے آغاز کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ آغاز نہیں ارتقا ہے اس لئے میں نے ابتدائی سطروں میں عرض کر دیا تھا کہ اردو کا آغاز کب ہوا۔ یہ سوال بے معنی ہے۔ ہاں! یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اردو نے اپنا موجودہ روپ کب اختیار کیا۔ بنگالی، گجراتی، پنجابی، سندھی کی طرح اردو بھی ایک مستقل اور آزاد زبان ہے اردو کے ابھار اور نکھار کی نوعیت بھی وہی ہے جو ان زبانوں کے نکھار اور ابھار کی ہے۔ خاص طور سے اردو کے آغاز کا ذکر کر کے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے جو ایک تاریخی واقعہ ہے اس کا جوڑ لگانا کسی طرح بھی صحیح یا مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایک زبان کے بولنے والے ترکِ مقام کر کے جب کسی دوسری جگہ جاتے ہیں تو ایک عرصے تک ان کی زبان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس کے بعد دھیرے دھیرے تبدیلی رونما ہوتی ہیں اور جب یہ تبدیلیاں بڑھ جاتی ہیں۔ تو زبان متعدد بولیوں میں بٹ جاتی ہے یا ایک زبان کی کئی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ دو بولیوں کا مشترک سرمایہ ان کے مخصوص اختلاف پیدا کرنے والے سرمایہ سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ دو ہمسر بولیوں کا مشترک سرمایہ ان کے اور ان کی اصل یعنی اس زبان کے درمیان بھی مشترک ہو جس نے ان بولیوں کو جنم دیا۔ لیکن ابتدائی مراحل میں امتیاز پیدا کرنے والے سرمایے کے

مقابلہ میں مشترک سرمایہ زیادہ ہونا چاہیئے اس لیے دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے درمیان رشتہ دریافت کرنے کے لیے مشترک سرمایہ کی کثرت یا قلت کو رہنما بنانا صحیح نہیں مثلاً یہ کہ بنگالی اور میتھلی میں آج مشابہتیں ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ لہٰذا بنگالی میتھلی کی ماں ہے یا اس کے برعکس میتھلی نے بنگالی کو جنم دیا غلط ہے۔ لسانی سرمایہ میں دو زبانوں کی شرکت یا ان کے مشترک سرمایہ کی کثرت اپنی جگہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک زبان اصل ہے اور دوسری اس کی فرع۔ سرمایہ میں اشتراک دو ہمسر بولیوں میں بھی ہوتا ہے اس کا فیصلہ کہ ان بولیوں میں سے کون سی اصل ہے۔ مشترک سرمایہ کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ دو بولیاں اجنبی نہیں عزیز ہیں غیر نہیں اپنی ہیں۔ ان کی قرابت کس قسم کی ہے اپنایت کی نوعیت کیا ہے یہ طے کرنے کے لئے ان کے اس سرمایہ کو دیکھنا ہوگا جو ان کے درمیان اختلاف کا باعث بنا اور جو انہیں ایک دوسرے سے دور لے گیا۔

ایک زبان میں اختلاف رونما ہونے کی دو صورتیں ہیں جن میں سے ایک زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے۔ گردوپیش اور خاص طبعی حالات کے زیر اثر زبان کے صوتی اور صرفی و نحوی سرمایہ میں تراش خراش ہوتی رہتی ہے لسانیات کی اصطلاح میں اسے تخفیفِ صوتی (PHONETIC DECAY) کہتے ہیں۔ اردو علامتِ اضافت "کا" اور "را" کو لیجیے۔ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے اس کی کسی قدیم ترین شکل (اپ بھرنش) میں "کا" اور "کیرا" (سنسکرت کاریہ) علامتِ اضافت کے طور پر مستعمل تھے۔ چند بردائی کی پرتھی راج راسو کی زبان قدیم کھڑی بولی یا قدیم اردو کی معاصر زبان ہے۔ اس میں "کیرا" اور "کیری" ("کا" اور "کی" کے معنی میں) عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔ ہیم چندر نے "کیر" کا ذکر کیا ہے۔

بقول ڈاکٹر بھنڈارکر یہ لفظ اپ بھرنش میں ملکیت یا تعلق ظاہر کرتا تھا۔ کبیر داس اور تلسی داس کے یہاں کیر کی جگہ کر اور کیری ہے۔ کیر اور کیری کا سراغ دکنی اردو میں بھی ملتا ہے امین دکھنی کا مصرعہ ہے۔

جو قاصد کیرے ہتھ نامہ چڑایا

قاصد کیرے ہتھ = قاصد کے ہاتھ

غواصی کہتا ہے:-

کہے پا کری مرد کیرا سنگا۔

مرد کیرا = مرد کا

اردو کا اور را قدیم کلا اور کیرے تحت صوتی کے زیر اثر بنا اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ کا اور را اب اردو کے ہیں۔ اردو کے مخصوص سرمایے میں شمار ہوتے ہیں اور بعض کو اس کی ہمسر بولیوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ یہ کلمے کا را اور کیر کی شکل میں پہلے بھی موجود تھے اور قدیم اردو کے ساتھ اس کی معاصر بولیوں قدیم برج گجراتی وغیرہ میں مستعمل تھے جب اردو کا روپ نکھرا اور اس کے خط و خال ابھر کر نمایاں ہوئے تو کار۔ کیر وغیرہ قدیم الفاظ زبان کی خراد پر چڑھ کر کا اور را کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ آج کا اور را وغیرہ صورت بدلے ہوئے الفاظ کو دیکھ کر ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ کار اور کیرے ڈھلے ہیں۔ جس زبان میں کا اور را کی یہ قدیم شکلیں کسی زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں وہ اردو کی موجودہ شکل سے زیادہ قدیم ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ زبان کے مخصوص سرمایے کا جس کی بنا پر زبان کی انفرادیت اور اس کی آزاد و جداگانہ شخصیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح تجزیہ کرنے کے بعد اس کے اصل و ماخذ نیز آغاز کی بابت کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا فیصلہ علمی ہوگا اور اسے لسانیاتی اور تحقیقاتی بنیادوں پر استوار کہا جا سکے گا۔

'کا' اور 'را' کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'کا' 'اڈکیر' سے بنے 'کار' اور 'کیر' 'کا' اور 'را' سے زیادہ قدیم ہیں۔ زبان تحت صوتی کے زیادہ تر برابر ترشتی رہی اس کا میلان تخفیف، تسہیل نیز اختصار کی طرف رہا اس لئے 'کار' سے 'کا' اور 'را' (را کا الف فتحہ 'ر' کی جگہ ہے۔ نیا اضافہ شدہ حرف نہیں) وضع کئے گئے اس کے برعکس 'کا' 'را' سے 'کار' اڈکیر نہیں ہو سکے لیکن جہاں تخفیف کا عمل ہوا اور جُدا جُدا دو مختلف کلمے دو زبانوں میں مستعمل ہوں وہاں یہ فیصلہ کہ ان میں سے کون سا کلمہ قدیم ہے کون سا جدید کس بنیاد پر کیا جائے گا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ زبان کا ایک علم اصول ابدال ہے یعنی ایک آواز کا دوسری آواز سے بدل جانا۔ مثلاً 'و' کا 'ب' ہو جانا یا 'ک' کا 'گ' سے بدل جانا۔ ابدال کے خاص خاص قاعدے ہیں جو ابدال کے رخ اور اس کے میلان کا پتا دیتے ہیں۔ یہ قاعدے مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اہل علم نے وضع کئے۔ ان قاعدوں کی مدد سے یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ دو مختلف کلمات میں سے اصل کون ہے۔ اور کس نے کس کو جنم دیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے میں اردو 'را' اور پنجابی 'ڈا' کی مثال پیش کروں گا۔ یہ دو کلمے حاضر اور متکلم ضمیروں میں لاحقہ اضافت کے طور پر اردو اور پنجابی میں مستعمل ہیں:۔

(اردو)	(پنجابی)
تیرا	تواڈا
تمہارا	تساڈا۔ تہاڈا
میرا	ساڈا
ہمارا	اساڈا

یہ کلمے بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں ایک دوسرے سے ماخوذ نظر نہیں آتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پنجابی 'ڈا' جیسا کہ ڈاکٹر مجمدار نے لکھا ہے، 'را' کا بدل ہے

ان کا بیان ہے کہ 'ز' بعد 'ڈ' کے تلفظ میں اشتباہ و اختلاط کے باعث اکثر ان میں تبادلہ ہوا[1] 'ز' نے 'ڈ' کی جگہ لی اور 'ڈ' نے 'ز' کی۔ لیکن یہاں 'ز' زیادہ قدیم ہے اور 'ڈ' بعد کی کی ہے۔ قدیم سنسکرت اور پراکرت کلمات کا یہ 'اتنگیرے' 'ز' کی بآسانی توجیہ ہو جاتی ہے اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ 'ز' نے اول اول پنجابی ضمیروں میں 'ڈ' کی شکل اختیار کی اس کے بعد 'ڈ' نے 'د' کا روپ دھار لیا اور غائب کی ضمیروں نیز دوسرے کلمات میں [illegible] استعمال ہونے لگا۔ ڈاکٹر ہیورنلے کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جدید آریائی زبانوں میں ر، ل، ٹ نے کہیں کہیں 'ڈ' کا روپ اختیار کر لیا ہے[2]

یہ تقلیب کلمات کا ارتقا ہے۔ اپنی اصل سے جدا ہونے کے بعد بولیاں اسی انداز سے ارتقا پا کر نیا روپ یعنی تراش خراش کر بدلتی اور اصل زبان سے الگ ایک منفرد شخصیت کی مالک بنتی ہیں۔ ایسے میں تغیر و تبدل زیادہ تر اصول ارتقا یعنی تحت شعوری کے زیر اثر عمل میں آتا ہے لیکن کبھی کبھی نئی بولیاں پاس پڑوس کی قریب یا بعید، عزیز یا غریب، اپنی یا پرائی زبانوں سے کچھ الفاظ اور کلمات مستعار لے کر اپنا لیتی ہیں اور اس طرح اپنے قدیم سرمایہ میں جو انہیں اپنی اصل سے ترکے میں ملا تھا، اضافہ کر کے مائل ترقی ہمکنار ہوتی ہیں۔ پہلی صورت میں کچھ کھو کر انہوں نے ترقی کی تھی اور ایک منفرد و آزاد شخصیت پائی تھی۔ اس صورت میں کچھ پا کر ترقی کی۔ لیکن زبان کی بناوٹ اور اس کی صرفی نحوی ساخت پر اس اخذ اور استفادہ کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔ زبان کا ڈھانچہ زیادہ تر وہی رہتا ہے بلکہ برسوں کی ہوئی چیزیں اس کی فطرت میں داخل نہیں ہوتیں۔ زبان الفاظ اور مفرد کلمات جتنے چاہے درآمد کر کے ان سے اپنی تہی دامنی کا علاج کرے صرفی نحوی تعمیر جوں کی توں رہتی ہے۔ مثلاً [illegible] اس طرح گزر جاتی ہیں کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔

---

[1] [illegible] صفحہ ۳۶
[2] مجموعہ زبانوں کی گرامر صفحہ ۱۲۔

بہرحال کم ہی سہی اضافے کے بعد بھی بولیوں میں اختلاف رونما ہوا پنجابی نے "کا" اردو سے لیا۔ اس کا اپنا اضافی کلمہ جو اسے اپنی اصل سے ملا "دا" ہے جسے کاٹ تراش کر اس نے پہلے "ڈا" بنایا پھر "دا"۔ کوں (کو) گہ (گا) اور نوں (نا) خاص اردو کے ہیں جو نے انہیں اردو سے لیا۔ اخذ و استفادہ کی یہ چند مثالیں وضاحت کے لئے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر اس کا ثبوت پیش نہیں کیا کہ یہ اصطلاحات پنجابی اور برج میں اردو سے گئے۔ اس قسم کے درآمد کئے ہوئے الفاظ و کلمات نیز لاحقوں سے زبان کا آغاز اور اس کا ماخذ متعین کرنے میں کوئی روشنی نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلاں زبان نے فلاں زبان سے استفادہ کیا۔ چراغ سے چراغ جلایا ہنگامہ تانگ کر محفل سجائی۔ لیکن یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ ہمیشہ سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے۔ محفلیں اسی طرح روشن ہوئی ہیں۔ زبانوں نے چراغ سے چراغ جلا کر ہی شبستانوں کو منور کیا ہے۔ اُردو نے خصوصیت کے ساتھ اس میں کبھی کوئی شرم نہیں کی۔ جہاں سے اُسے جو کچھ ملا بے تکلف ہاتھ بڑھا کر لے لیا، اس لئے آج اسے یہ طعنہ سننا پڑا کہ اُردو کھچڑی زبان ہے بقول شخصے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

---

(۳)

مختلف نظریے

اُردو کے آغاز کے سلسلے میں آج تک جو نظریے اہلِ علم نے پیش کئے اُن میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ سبھی قسم کے ہیں ان میں سے ایک نظریہ جسے میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اردو کھچڑی ہے۔ چڑیا لائی چاول کا دانہ چڑا لایا مونگ کا دانہ دونوں نے مل کے کھچڑی پکائی۔ عربی فارسی الفاظ مسلمان اپنے ساتھ لائے ہندوؤں نے ہندی افعال و حروف فراہم کئے، ہندو مسلمان کے میل ملاپ سے اُردو نے شکل کپڑنے میں بلا شبہ اس سے کچھ پہلے جنم لیا مسلمان اہلِ علم زیادہ تر اسی خیال کے ہیں۔ مسٹر بریکو فرماتے ہیں —

"ہندی مسلمانوں میں ابھی تک یہ خیال عام ہے کہ اردو ان مختلف زبانوں اور بولیوں کے اختلاط و آمیزش کے بعد جو مغلوں کے دربار میں بولی جاتی تھیں وجود میں آئی[1]"

---

[1] بلیٹن اورینٹل اسکول آف اسٹڈیز لندن ج ۸ صفحہ ۳۷۷-

میرا تعلق ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد تک مسلمان اہلِ علم نے اردو کے آغاز کی بابت جو کچھ لکھا ہے مولانا شیرانی نے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے میں اس کو دہرا کر طولِ مقال کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا ان اقوال کا خلاصہ مولانا صہبائی کے لفظوں میں پیش کئے دیتا ہوں۔[۱]

"فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرتِ استعمال کے سبب تغیر و تبدل واقع ہوا اور اس خلاملا سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔"[۲]

مولانا شیرانی اگرچہ اردو کو ان مسلمان اہلِ علم کی طرح خود سی شہری الفاظ کے خلط کا نتیجہ نہیں سمجھتے لیکن وہ اس سے پوری طرح متفق ہیں کہ اردو کا آغاز اسوقت ہوا جب مسلمان ہندوستان آئے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"میرے خیال میں اس کو ہماری ابلہی ماننا ہوگا جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔"

مسلمان اہلِ علم نے اردو کا سنگِ بنیاد دہلی میں رکھ کر اس کا نشو و نما خلجیوں کے عہد میں دکھایا، اور شاہجہان کے عہد میں پروان چڑھایا۔ مولانا شیرانی پنجاب کو اس کا مولد بتاتے اور غزنویوں کے عہد میں اسے پھلتا پھولتا دکھلاتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ مولانا شیرانی عام مسلمان اہلِ علم کے خلاف اردو کی قدامت کے قائل ہیں وہ اس کے آغاز کو مغلوں یا خلجیوں سے پیچھے ہٹا کر غزنویوں کے عہد تک لے گئے ہیں اور بات یہ ہے کہ ان کی کوشش رائگاں گئی۔ اردو وہیں رہی جہاں مسلمان اہلِ علم نے اسے رکھا تھا اور پنجابی اس سے آگے بڑھ گئی۔ مولانا نے اردو کی قدامت دکھانے کے لیے قلم اٹھایا تھا۔ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ان کا قلم اچانک قلم پنجابی کی قدامت دکھانے

---

[۱] بحوالہ پنجاب میں اردو (طبع دوم) صفحہ ۴۴
[۲] پنجاب میں اردو مقدمہ صفحہ (الف)

کے عنوان سے میں نے تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اُردو آج کی زبان ہے اس کی اپنی شخصیت ہے جو اُسے آس پاس کی دوسری بڑی بولیوں سے ممتاز بناتی ہے۔ سوال اس عنوان کا ہے کہ یہ کب وجود میں آئی اور اس کے خط و خال کب ابھرے کہ وہ اپنے پڑوس کی بولیوں سے ممتاز اور مختلف زبان بنی؟ مولانا شیرانی کے بقول اُردو اگر "اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنی" تو وہ بارہویں صدی عیسوی سے پہلے پنجاب میں[1] کہاں پہنچ گئی۔ اور اگر "پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی جاتی ہے"[2] تو وہ اردو نہیں پنجابی ہے۔

مولانا شیرانی مرحوم علم لسان اہلِ علم کی طرح اُردو کو مسلمانوں کی آمد سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ بظاہر اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی اور بڑی وجہ میرے خیال میں اردو کا عربی و فارسی سرمایہ ہے۔ اردو میں ہند و پاکستان کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں فارسی عربی الفاظ بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ ان الفاظ کی فراوانی کو دیکھ کر اہلِ علم نے سمجھا کہ "اُردو اسلامی دور میں اسلامی اثرات میں بنی" اور وہ اردو کی ابتدا کا جوڑ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے قیام و استقرار سے لگانے لگے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کسی زبان کے لئے دوسری زبان سے اخذ و استفادہ عام اور سامنے کی بات ہے۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی اور ترقی یافتہ زبان نے فاتح اقوام کی زبان سے استفادہ کیا۔ اس کے الفاظ و کلمات کی آغوش کھول کر پذیرائی کی۔ انگریزی نے فرانسیسی کی وساطت سے لاطینی الفاظ، سابقے، لاحقے، جمع کے قاعدے، تذکیر و تانیث کے اصول بڑی بے تکلفی سے قبول کئے جو آج انگریزی کے مزاج میں دخیل ہیں۔ اردو نے عربی و فارسی عناصر کے ساتھ اتنی بے تکلفی نہیں برتی البتہ یہ عناصر اردو کی فطرت میں جذب ہو سکے۔ اس کے باوجود اردو کو اُردو والوں نے مسلمانوں کی ساختہ و پرداختہ

---

۱ پنجاب میں اردو مقدمہ صفحہ ۳

۲ پنجاب میں اردو مقدمہ صفحہ ۴

زبان بتایا۔ انگریزی والوں میں سے کسی نے بھی موجودہ انگریزی کی پیدائش کو نارمن فتوحات کا نتیجہ قرار نہیں دیا۔ ہمارے اہلِ علم نے اس پر غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس میں شک نہیں اردو نے فارسی و عربی الفاظ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کئے جو سب کے سب اردو ہو گئے لیکن اردو کا مزاج بدستور ہند آریائی رہا۔ فارسی و عربی کا اس پر کوئی پرچھاواں نہیں پڑا۔ فارسی و عربی اثرات جنہیں اسلامی اثرات کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی بنا پر اردو کی ابتدا مسلمانوں کی فتوحاتِ ہند سے بتائی جاتی ہے یہ ہیں:۔

(۱) فارسی و عربی کے مفرد الفاظ جنہیں ہم دخیل کہتے ہیں۔ جیسے کتاب۔ خط پیام وغیرہ

(۲) یائے نسبت۔ جیسے کبابی۔ دہلوی وغیرہ۔

(۳) اضافت جیسے آبِ جو۔ دانۂ الائچی۔

(۴) فارسی و عربی جمع کے قاعدے۔ جیسے۔ کتب۔ مجالس۔ بندگانِ خدا وغیرہ

(۵) کہ بیانیہ۔ واو عطف اور چند سابقے۔ بے۔ بد وغیرہ

(۶) فارسی و عربی مرکبات۔ خوش لب۔ بین السطور۔ مابین۔ درمیان۔

ان میں سے مفرد الفاظ اور مرکبات کا تعلق فرہنگ سے ہے اور میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ زبان کی فرہنگ میں ضروری نہیں کہ تمام الفاظ اس زبان کی پیداوار ہوں۔ وہ دوسری زبان سے بھی لے جا سکتے ہیں ان کی وجہ سے زبان کے مزاج، اس کی فطرت اور شخصیت پر کوئی زد نہیں پڑتی یائے نسبت اور اضافت یا جمع کے طریقے زبان کا جزو ہیں۔ اس لئے اس کی فطرت میں داخل ہیں۔ لیکن معیاری اردو میں ابھی تک نسبت، اضافت اور عربی و فارسی جمع کے طریقے دیسی یعنی ہندی الاصل الفاظ تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ ہندی لفظ کی طرف ہندی، فارسی، یا عربی لفظ

کی اضافت یا ہندی لفظ کے آخر میں یائے نسبت کا الحاق، یا عربی و فارسی قاعدے سے اس کی جمع ان میں سے کسی چیز کو بھی آج صحیح نہیں سمجھا جاتا اور اس قسم کی ترکیب اسلاف میں سے اگر کسی نے استعمال کی ہے تو اسے "گنگا جمنی" کہہ کر مضحکہ اڑایا جاتا ہے مثلاً ولی کا شعر ہے:-

گنگا رواں کیا ہے اُس کے نین سیتی　　آ اے صنم شتاب کہ روزِ نہان ہے

سودا کہتے ہیں:-

تحفہ ہے گُل نورستہ کی رنگ آمیزی　　پوشش چھینٹ قلمکار بہ دستِ جبل

میرزا مظہر جانجاناں کے مندرجہ ذیل شعر میں ہندی لفظ کی اضافت ہندی لفظ کی طرف کی گئی ہے۔

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن　　نہایت منہ لگایا ہے جن میں بیڑیاں کو

مقام کی طرف نسبت کر کے مقامی کہہ سکتے ہیں لیکن جگہ کی طرف نسبت کر کے جگہی کہنا غلط ہے۔ آب جو صحیح ہے۔ آب گر مطلق غلط۔ قاعدہ کی جمع قواعد درست ہے لیکن اس کے قیاس پر لوٹے کی جمع لواٹی درست نہیں۔ واؤ عطف کا حال بھی یہی ہے اس کے ذریعے دو فارسی لفظ یا ایک فارسی اور ایک عربی یا عربی الفاظ جوڑے جا سکتے ہیں ہندی انگریزی، ہندی فارسی، یا عربی انگریزی لفظوں کے درمیان جو آج اردو میں مستعمل ہیں: واؤ عطف لانا غیر فصیح ہی نہیں نا صحیح بھی ہے۔ اُسے دیکھ کر اہلِ زبان ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ فارسی لاحقے اگرچہ آہستہ آہستہ زبان کے مزاج میں درک حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اور ادھر کوئی ساٹھ ستر سال سے بے دھڑک، بے لاگ، بے ڈھب قسم کی ترکیبیں جن میں سابقہ فارسی ہے اور لفظ ہندی، عوام کے دربار میں قبول عام پا رہی ہیں لیکن فصحا بدستور انہیں ٹکسال باہر سمجھتے اور تا بمقدور ان کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔

اردو کا سرمایہ جس کا ذکر میں نے مقالے کی تمہیدی سطور میں کیا آپ کے سامنے

ہے۔ اس میں سے کون سی چیز ہے جسے مسلمانوں نے وضع کیا، جس سے اردو کا خمیر بنا اور اس کا کالبد تیار ہوا؟

اس غلط فہمی کی دوسری وجہ مسلمانوں کا وہ سرپرستانہ اور مربیانہ سلوک ہے جو انہوں نے اردو کے ساتھ روا رکھا۔ اردو مسلمانوں کے فتح دہلی سے پہلے دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اور برج یا اودھی کے مقابلے میں گری پڑی پسماندہ اور برخاک افتادہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے اٹھا کر اسے سینے سے لگایا اور نوک پلک سے درست کر کے اس قابل بنایا کہ اس کے ذریعے شاعرانہ خیالات کا اظہار ہو سکے۔ اس میں علمی اور فنی کتابیں لکھی جا سکیں۔ مسلمان جہاں گئے اردو ان کے ہمرکاب رہی۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اردو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی اور مقامی بولیوں کو پیچھے ڈھکیل کر اس نے مسلمانی قلمرو کی وسعت کے مطابق بہت جلد ایک عام اور ملک گیر زبان کا مقام حاصل کر لیا۔ شاید اس سرپرستی اور تربیت کی بنا پر اردو کو مسلمانوں کی وضع کردہ زبان سمجھ لیا گیا۔ اردو کا نشوونما مسلمانوں کی سرپرستی اور ان کے سیاسی اقتدار کے زیر سایہ ہوا لیکن زبان خود مسلمانوں کی دہلی میں آمد سے پہلے دہلی میں موجود تھی اور ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔ اس کے ارتقا کو ابتدا سمجھ کر اردو کو مسلمانوں کی ساختہ زبان قرار دے دیا گیا۔ میرے خیال میں ان دو وجوہ کے سوا کوئی تاریخی یا لسانی توجیہ اس بے بنیاد خیال کی پیش نہیں کی جا سکتی۔

مولانا شیرانی مرحوم کے نظریے پر کہ "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سے دہلی جاتی ہے" تفصیلی بحث اس مقام پر کریں گے جہاں اردو کی ابتدا سے متعلق سوچے سمجھے اور سنجیدہ نظریوں کا ذکر ہوگا۔ یہاں مولانا کے نظریۂ ہجرت اردو کے تاریخی پہلو کی بابت یہ واضح کر دوں کہ اس کا منشا در حقیقت یہ خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کی سندھ و پاکستان میں آمد سے پہلے کوئی زبان نہ تھی۔ وہ مسلمانوں کے اثر سے

وجود میں آئی۔ عام مسلمان اہلِ علم نے اردو کی ابتدا شاہ جہانی عہد میں کاروباری ضرورت سے بتائی تھی۔ مولانا شیرانی نے اس کو اساس ٹھہرا کر لکھا[1] "اکبر اور شاہ جہاں سے پیشتر ہندو اور مسلمان نہ تھے۔ یا ترک سوداسلف نہیں بیچتے تھے یا مختلف قومیں ایک جگہ رہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر اکبر یا شاہ جہاں کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جائے"۔ انہوں نے مسلمان اہلِ علم کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ اردو مسلمانوں کے اثر سے بنی۔ مسلمان شاہ جہاں اور اکبر سے پہلے ہندوستان پہنچ چکے تھے۔ اکبر یا شاہ جہاں کے عہد میں کس وجہ اردو کی بنیاد رکھی جائے "غزنویوں کے زمانے سے اردو کا آغاز کیوں نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے عام مسلمان اہلِ علم کی رائے میں ترمیم کر کے کہا[2]:-

"اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کیا" مسلمان اول اول پنجاب گئے تھے! "وہ کم و بیش ایک سو ستر سال حکمرانی کرنے کے بعد انہوں نے دہلی کا رخ کیا۔ اردو اگر مسلمانوں کے اثر سے بنی تو پنجاب میں بنی جہاں وہ ڈیڑھ سو سال سے رہتے بستے تھے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پنجاب کی زبان آج اردو نہیں پنجابی ہے۔ اس کا حل مولانا نے یہ نکالا کہ غزنویوں کے عہد میں اردو پنجابی سے مختلف زبان نہ تھی وہ پنجابی تھی۔ مسلمان اس زبان کو ساتھ لے کر دہلی گئے۔ وہاں برج کے اثر سے کچھ تبدیلیاں ہوئیں تو موجودہ اردو کا خاکہ تیار ہوا اور اس نے وہ شکل اختیار کی جو آج اسے پنجابی سے امتیاز بخشتی ہے۔ اس پورے استدلال کی اساس جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کے اثر سے وجود میں آئی۔ اوپر کی سطروں میں اس کی حقیقت واضح کر چکا ہوں یہ سمجھ میں نہیں

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۹۲

[2] پنجاب میں اردو صفحہ ۲۴

ہوا کہ آخر شعر کی ابتدا کا مسلمانوں سے یا سرزمین ہند میں ان کے سیاسی اقتدار کے قیام و استحکام سے کیا تعلق ہے اور کون سی چیز ہے جو اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اردو کو ہجرت کرا کے دہلی لے جائیں۔ تاریخ ہمیں صرف اتنا بتاتی ہے کہ مسلمان دہلی فتح کرنے سے پہلے کم و بیش ایک سو ستر سال پنجاب میں رہے بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں دہلی فتح ہونے پر وہ دہلی چلے آئے جو مسلمان پنجاب میں ڈیڑھ سو سال سے آباد تھے انہوں نے پنجاب کی زبان سیکھی وہ اسے بستے ہوئے دہلی پہنچے۔ یہ تاریخ نہیں قیاس ہے۔ فوج میں عام طور سے اٹھارہ سے بیس سال تک کے نوجوان بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ نوجوان پنجاب میں پیدا ہوئے ولایت زادہ تھے یا پنجاب میں عرصے سے آباد تھے نو وارد تھے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ دہلی جانے والے نوجوان عرصے سے پنجاب میں آباد تھے۔ اور انہوں نے اس درمیان میں پنجاب کی زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی۔ تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس زبان نے جو مسلمان پنجاب سے سیکھ کر گئے کسی قدر تغیر و اصلاح کے بعد اردو کی شکل اختیار کی یہ اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ دہلی میں اس وقت کوئی زبان رائج نہ ہوتی جسے وہاں کے باشندے (جن کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہوگی) عام طور سے بولتے ہوں یہ تاریخ اور اصول لسانیات، دونوں کے خلاف ہے دہلی میں اس وقت پنجابی اور برج دونوں سے الگ ایک زبان بولی جاتی تھی اور جیسا کہ خود مولانا شیرانی نے لکھا ہے امیر خسرو، ابوالفضل اور شیخ باجن اس زبان کو دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں ؟

اس کے علاوہ اگر یہ صحیح ہے کہ اردو کی داغ بیل اس دن سے پڑنی شروع ہوئی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں توطن اختیار کیا تو اردو کا مولد وادی سندھ کو ہونا چاہیئے پنجاب سے کئی سو سال پہلے مسلمانوں نے سندھ فتح کیا۔ دریائے

سندھ کی وادی میں مدتوں خیمہ زن رہے اور اس کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے سندھی زبان سیکھی۔ اصطخری چوتھی صدی کا سیاح ہے اس کا بیان ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی بولتے ہیں اردو پنجابی کی شکل میں دہلی جا سکتی تھی سندھی ملتان اور لاہور ہوتے ہوئے دہلی کیوں نہیں جا سکتی؟ مولانا شیرانی فرماتے ہیں "جب مسلمان سندھ اور پنجاب پر قابض ہو گئے تو سندھ میں نہیں تو پنجاب میں انہیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہے" مولانا سید سلیمان مرحوم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے سندھ میں وہاں کی بول چال کی زبان سندھی اختیار کی۔ مولانا شیرانی کے اصول کے مطابق مولانا سید سلیمان کا فرمانا بے جا نظر نہیں آتا۔ مسلمان پنجاب سے پہلے سندھ پر قابض ہوئے۔ اصطخری کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ میں سندھی بولی جاتی ہے۔ ہر چند سندھی اور اردو میں مشابہت اس درجے کی نہیں جس درجے کی اردو اور پنجابی میں ہے لیکن مولانا شیرانی کے طریق استدلال کو مثال بنا کر کہا جا سکتا ہے کہ سندھی نے اول اول پنجابی کا روپ اختیار کیا اور آخر آخر وہ اردو کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ اردو کو سندھ سے نکلے یا سندھی سے بچھڑے بہت زیادہ عرصہ ہوا۔ سندھ سے نکل کر دہلی تک پہنچتے پہنچتے اسے طویل مسافت بھی طے کرنی پڑی اس لئے اردو اور سندھی کی لسانی مشابہتیں پنجابی کے مقابلے میں کم ہیں۔

دو یا دو سے زیادہ زبانوں کی قرابت داری کا فیصلہ ان کے سرمایہ کو دیکھ کر اور اس کے گہرے تقابلی مطالعے کے بعد کیا جاتا ہے لسانی دلائل کی تائید میں تاریخی شہادت پیش کی جا سکتی ہے لیکن یہ شہادت تائیدی ہوگی —— اعتماد صرف لسانی شہادت پر کیا جائے گا۔ مولانا شیرانی نے ترتیب بدل کر تاریخ کو اساس قرار دیا اور اس کی حمایت میں لسانی دلائل پیش کر دیئے یہ طریقہ اصول لسانیات کے خلاف تھا۔ اسے بہت کر ہر شخص غلط سے غلط نتائج اخذ کر سکتا ہے چنانچہ اول اول میر امن، سر سید احمد خاں، مولانا صہبائی، مولانا آزاد وغیرہ

علماء نے اس استدلال سے کام لے کر اُردو کا آغاز شاہ جہاں اور اکبر کے عہد میں بتایا اور آخر آخر مولانا سید سلیمان ندوی نے تجویز پیش کی کہ اس کی ولادت سندھ میں مانی جائے یہ تاریخ اور لسانیات کی ترتیب بدلنے اور ان میں الٹ پلٹ کر دینے کی وجہ سے ہوا۔ تاریخ لسانیات کا ماخذ نہیں لسانیات تاریخ کا ماخذ ہے علماء تاریخ نے تاریخی واقعات اور نتائج لسانیات سے اخذ کیے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لسانی فیصلے تاریخ کی مدد سے کیے گئے ہوں۔

ڈاکٹر ہورنلے نے جو ہند آریائی زبانوں کے بہت بڑے ماہر ہیں، اردو کو ایک طرح کی مخلوط زبان بتایا تھا۔ وہ لکھتے ہیں[1]۔

"اردو مقابلتہً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں، جو مسلم اقتدار کا مرکز تھا اردو بارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی یہ علاقہ برج، مارواڑی، پنجابی کے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی"

ڈاکٹر گریرسن نے ۱۹۰۰ء میں ڈاکٹر ہیورنلے اور مسلمان اہل علم سے متاثر ہو کر اردو کو ملی جلی زبان بتایا[2]۔

"اردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی فارسی، ترکی، تیلگو زبان کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کے صرفی نحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولی

[1] گوڈی زبانوں کی گرامر مقدمہ صفحات ۷،۶

[2] کلکتہ ریویو ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵۶

سے خوشہ چینی کی ہے اس لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پاکر بنی ہے "

لیکن ۱۹۰۰ء کے قریب ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ لیتے وقت انہوں نے اس خیال سے رجوع کر لیا۔ اور اردو کو بالائی دوآبے اور مغربی روہیل کھنڈ کی ہندوستانی پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا۔

" ہندوستانی کے آغاز کے بارے میں آج تک اہل علم نے (جن میں میں خود بھی شامل ہوں) جو کچھ لکھا ہے میر امن کے دیباچہ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میر امن کے بیان کے مطابق اردو ان مختلف لوگوں کی بولیوں کی معجون مرکب ہے جو دہلی کے بازار میں جمع ہو گئے تھے۔ اس غلط فہمی کا اول اول سر جان بس لایل نے ۱۸۸۰ء میں رد کیا۔ ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی جائزے نے اب اس کو ثابت کر دیا ہے۔ کہ ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبے اور مغربی روہیل کھنڈ کی (بول چال کی) زبان ہے۔ ان گنوار اور کنوارو الفاظ و محاورات نکال کر جسے ادبی نکھار سنگھار دے دیا گیا ہے[۱] "

۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان انہوں نے بالائی دوآبے کی وضاحت ان الفاظ میں کی:۔

" ہندوستانی مغربی ہندی کی وہ شاخ ہے جس کا وطن بالائی دوآبہ گنگ ہے جو میرٹھ کے گرد و نواح میں واقع ہے "۔

اس کے باوجود اب تک ہندی اور مغربی اہل علم کی خاصی بڑی تعداد اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اردو مختلف بولیوں اور زبانوں کا ملغوبہ ہے مسٹر بارنیکوف لکھتے ہیں[۳]۔

---

[۱] " ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ " ج ۹ حصہ اول حاشیہ صفحہ ۴۴
[۲] امپیریل گزیٹیر (ہند ۱۹۰۷ء) صفحہ ۳۶۵
[۳] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ صفحہ ۳۷۷

"میر امّن نے اردو کے آغاز سے متعلق جس خیال کا اظہار کیا تھا اسے متعدد مغربی علما نے قبول کر لیا جن میں سے کچھ آج بھی اردو کو ایک طرح کی بناوٹی زبان مختلف بولیوں اور زبانوں کا مرکب سمجھتے ہیں۔"

ہیورنلے کی رائے مسلمان اہل علم کی رائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں مسلمان عالموں کی طرح وہ اردو کو مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ زبان نہیں بتلاتے مسلمان سپاہیوں اور مقامی ہندو باشندوں کے اختلاط اور ملاپ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پنجابی، مارواڑی عناصر کی آمیزش کے بعد برج بھاشا نے اردو کا روپ اختیار کیا۔ برج، پنجابی، مارواڑی کے اختلاط و ترکیب کے بعد اردو وجود میں آئی۔ گریرسن نے اردو کے صرفی، نحوی سرمایے کو مساوی طور سے ان زبانوں سے ماخوذ بتایا تھا ہیورنلے نے اس میں یہ فرق کیا کہ پنجابی مارواڑی سرمایہ اردو میں برجی سرمایہ کے مقابلے میں کم ہے۔ اس نظریے کو بھی میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں۔ ایک طرح سے یہ بھی اردو کو کھچڑی زبان قرار دیتا ہے۔ سنجیدہ نظریے دو ہیں۔ اردو برج سے ماخوذ ہے۔ اسے اردو میں سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے پیش کیا۔ اردو اصلاً پنجابی ہے اس کا بڑا اور اہم سرمایہ پنجابی سے لیا گیا۔ یہ مولانا حافظ محمود خاں شیرانی کا نظریہ ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے پنجابی اردو کی لسانی مشابہتیں دکھا کر یہ نتیجہ نکالا کہ اردو پنجابی سے ترقی پا کر وجود میں آئی۔ برج کے اثرات نے اسے ایک مستقل اور آزاد زبان کی حیثیت دی۔ غیر سنجیدہ نظریوں میں سے دوسرا نظریہ جسے ہیورنلے نے پیش کیا پہلے اور تیسرے نظریے کی آمیزش کا نتیجہ تھا۔ دوسرا سنجیدہ نظریہ تیسرے اور چوتھے نظریے کا مرکب ہے ان سب کی بنیاد آمیزش پر ہے۔ پہلے نظریے کی رو سے اردو اصلاً کوئی ایک زبان نہیں۔ مساوی طور سے کئی زبانوں کا مرکب ہے دوسرے اور تیسرے نظریوں نے اسے اصلاً برج قرار دیا۔ چوتھے نظریے نے اصلاً پنجابی بتایا اور پھر اس پر برج کی تہیں چڑھائیں۔ ڈاکٹر گراہم بیلی مولانا شیرانی کے ہم نوا

ہیں۔ وہ فرماتے ہیں لے

"تقریباً ۱۰۲۰ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی اصل ہے۔ اور قدیم کھڑی بولی مانند سوتیلی ماں، برج سے براہ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں۔۔۔۔ مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو جو ان دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیئے۔"

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر چٹرجی اور ڈاکٹر گریرسن اُردو کی تعمیر میں پنجابی کا ایک بڑا حصہ بتلاتے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مولانا شیرانی سے پوری طرح متفق ہیں۔ وہ اردو کی پیدائش پنجاب میں مان کر کہتے ہیں کہ اُردو نے پنجاب سے ہجرت کی تو اس کی منزل دہلی ہوئی۔ دہلی سے اس نے دکن و گجرات کا رُخ کیا۔ ان نظریوں کا ماحصل مختصر الفاظ میں پیش کرنے کے بعد ان پر بحث کرنا مناسب ہوگا۔

(۱) اردو مسلمانوں کی آمد سے پہلے کوئی زبان نہ تھی۔ دہلی اور اس کے نواح میں پنجابی برج، مارواڑی وغیرہ زبانوں کے اختلاط و ارتباط سے اردو وجود میں آئی۔

(۲) پنجابی، مارواڑی عناصر قبول کرنے کے بعد برج بھاشا نے جو روپ اختیار کیا اس کا نام اردو ہے۔ اردو برج بھاشا سے ماخوذ ہے۔

(۳) اردو اصلاً پنجابی ہے جس نے دہلی پہنچ کر برج اور مارواڑی اثرات میں اردو کی شکل اختیار کی یعنی اردو پنجابی سے ماخوذ ہے۔

میں نے اوپر تمہیدی سطور میں عرض کر دیا تھا کہ کوئی زبان دو یا دو سے زیادہ زبانوں سے مل کر کبھی اس طرح وجود میں نہیں آتی کہ اصل و اساس کے لحاظ سے وہ دونوں میں سے ایک زبان نہ ہو۔ دونوں کا مجموعہ ہو کچھ بنیادی عناصر اس نے ایک زبان سے لئے ہوں اور کچھ دوسری سے اور یہ مشترک عناصر یکساں اور مساوی درجے کے ہوں ترازو کے

لے جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۹۱

دونوں پلڑے برابر ہوں۔ یہ قیاسِ صحیح کے خلاف ہے۔ زبانوں اور بولیوں کی تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی ڈیڑھ سو سے اوپر بولیوں میں سے جو اس کے طول و عرض میں رائج ہیں کوئی بولی بھی مخلوط نہیں۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے ملاپ سے کبھی کوئی تیسری زبان وجود میں نہیں آئی کہ وہ اصلوں سے جدا ہو۔ زبان زبان سے استفادہ کرتی ہے۔ کچھ دیتی ہے کچھ لیتی ہے۔ یہ لین دین عموماً فروعی یعنی غیر اساسی ہوتا ہے۔ دوسری زبان سے استفادہ کرنے کے بعد زبان کی فطرت نہیں بدلتی روپ بدل جاتا ہے مزاج میں تغیر نہیں ہوتا رنگ نکھر جاتا ہے۔ اردو ہی کی مثال لیجئے۔ اردو نے فارسی سے کتنا کچھ فیض اٹھایا اور اس کی وساطت سے عربی ترکی سے بھی استفادہ کیا۔ اس تمام سرمایہ کا، جو اردو نے فارسی، عربی، ترکی سے لیا۔ اختصار کے ساتھ اوپر ذکر کر چکا ہوں اور لسانی تجزیہ کر کے بتا چکا ہوں۔ کہ اردو کا یہ حاصل کردہ سرمایہ تمام تر غیر بنیادی ہے۔ اردو نے اسے اپنانے کے بعد بھی اس کا پرچھانواں اپنی فطرت، مزاج اور منہاج پر نہیں پڑنے دیا۔ وہ بدستور اردو کے ذاتی سرمایہ سے اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ رہا۔ اس سے تال میل نہ رکھ سکا۔ جب اردو کے اس سرمایہ کی یہ کیفیت ہے کہ وہ تقریباً سات سو سال گزرنے کے بعد بھی اردو کے مزاج میں دخل نہ پا سکا اور اس سے دور دور رہا تو ہم یہ کیسے باور کر لیں کہ اس زمانے کے لگ بھگ پنجابی، برج، مارواڑی، گجراتی عناصر نے گھل مل کر نئے مزاج نئی فطرت، نئی روح اور نئے چلن کی زبان کا ڈول ڈالا۔ مختلف عناصر ایک قالب میں ڈھل گئے اور گھل مل کر ایک نئی زبان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

زبانوں کا تال میل نہیں ہوتا جب تک بولنے والوں کا میل ملاپ نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ شمالی ہند کی جن زبانوں کے تال میل سے اردو وجود میں آئی ان کے بولنے والوں کا ملاپ کہاں اور کیسے ہوا؟ ڈاکٹر مسعود نے دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے کو پنجابی، برج، مارواڑی کا سنگم بتلاتے ہیں۔ اردو کی تخلیق میں زیادہ سے زیادہ ان تین زبانوں کا حصہ ہو سکتا

ہے۔ شمالی ہند کی دوسری زبانوں مثلاً نیپالی، گجراتی، سندھی، مغربی کے علاقے دہلی اور میرٹھ سے دُور ہیں۔ اردو کی تعمیر میں کیونکر شرکت کی، ان کی لہریں اردو کے علاقے تک کیسے پہنچیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ قیاس سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ تاریخ سے۔ اردو کے لسانی سرمایہ کو جو اردو اور شمالی ہند کے بعض زبانوں میں مشترک ہے سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ لسانیات کے لئے تاریخ کی تائید ضروری ہے اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا لسانیات کے وہ فیصلے جن کی توثیق تاریخ سے نہ ہو اس قابل نہیں کہ انہیں قبول کیا جائے۔

پنجابی، برج اور مارواڑی کا میل ملاپ تاریخی طور پر ممکن ہے لیکن دہلی اور اس کے نواح میں جہاں تین زبانوں کا کبھی سنگم تھا، ان کا میل ملاپ نہ ہوا، اور بولی جانے والی زبانوں کی حیثیت میں ہوا ہوگا۔ یہ زبانیں اس علاقے کی بولیاں ہوں گی۔ کچھ لوگ مثلاً پنجابی بولتے ہوں گے اور کچھ برج یا مارواڑی۔ بدستور یہ زبانیں اس علاقے میں بولی جاتی رہی ہوں گی۔ اس کے بعد لازماً اس طرح بنی ہوگی کہ کچھ پنجابی اور مارواڑی عناصر برج میں آگئے ہوں گے یا اس کے برعکس برجی اور مارواڑی عناصر پنجابی میں دخل پا گئے ہوں گے۔ اختلاط کی صاف اور سیدھی صورت یہی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ اس اختلاط و ارتباط کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ یہ لسانیات کے مسلم اصول کے خلاف بھی ہے۔ ماہرین لسانیات نے باتفاق اس امر کی تصریح کی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر ٹی۔ جی نکر کا بیان ہے[1] کہ زبان دوسری زبان کے الفاظ جتنے چاہے مستعار لے کر اپنا لے۔ ایک زندہ اور بولی جانے والی زبان غیر زبان کے صرفی نحوی قاعدے اور تعمیری اصول کبھی نہیں اپناتی۔ یہ زبان کی فطرت اور اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ زبانوں کی تاریخ اسے جھٹلاتی ہے۔ فارسی نے عربی سے استفادہ کیا۔ بے شمار عربی الفاظ اور مرکبات لے کر اپنا لئے لیکن عربی کے صرفی نحوی قاعدے اس کے لئے ویسے ہی اجنبی رہے۔ ڈاکٹر ٹنکر فرماتے ہیں، فارسی نے عربی قواعد کے ذخیرے سے صرف علامت جمع

[1] زبان کی فطری تاریخ صفحہ ۱۳۱

آت' تھی جو فارسی میں جڑ نہ پکڑ سکی۔ فارسی عربی الاصل الفاظ کی جمع 'ات' کے اضافے سے بنا لیتی ہے۔ فارسی الفاظ کی جمع حسب قاعدہ فارسی بنتی ہے مگر "ارشادات۔ فرمائشات" وغیرہ کے جیسے الفاظ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ فارسی میں علم نہیں۔ انگریزی نے بھی لاطینی سے جمع کے بعض لاحقے مستعار لئے تھے یہ لاطینی الفاظ تک محدود ہے۔

اس کے علاوہ اردو اگر پنجابی، برج اور مارواڑی کے اختلاط سے بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو 'تیرا' (ضمیر حاضر اضافی) کا 'تے' برج سے آیا۔ 'ر' مارواڑی سے لی گئی اور 'ا' پنجابی سے۔ یا "تو کرتا ہے" کا 'تو' 'ت' الگ ہے برج کے ہیں اور 'ا' پنجابی کا۔ یہ دو مثالیں ہیں۔ اردو کے باقی سرمائے کو اس پر قیاس کر لیا جائے۔ کیا کوئی صاحب ہوش اس کو صحیح سمجھ سکتا ہے۔ صرفی، نحوی قاعدوں اور لاحقوں، سابقوں کا اخذ و استفادہ خلاف عادت و فطرت تھا۔ ان کا تجربہ کرکے ان کے کسی ایک جزو کا ایک زبان سے لینا اور دوسرے جزو کا دوسری زبان سے، زبان کے مزاج، نقاب، تعمیر و تشکیل کی رسم و راہ کو دیکھتے ہوئے ناممکن نظر آتا ہے۔

شمالی ہند کی جدید آریائی زبانوں کا صرفی نحوی سرمایہ بڑی حد تک مشترک ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان زبانوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا اور یہ سرمایہ ایک سے دوسرے کے پاس، دوسرے سے تیسرے کے پاس منتقل ہوتا چلا گیا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبانیں متحد الماخذ یا قریب الماخذ ہیں۔ کسی قدیم زمانے میں یہ ایک زبان سے متفرع ہوئیں یا ایک جیسی کئی زبانوں سے نکل کر یہ ملک میں پھیلیں۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ اس لئے ان کا اختلاف جو شروع میں کچھ زیادہ نہ تھا بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مختلف آزاد زبانیں بن گئیں۔ ان زبانوں نے کچھ سابقے، لاحقے یا صیغے پاس پڑوس کی زبانوں سے بھی لئے۔ لیکن جیسا میں نے عرض کیا، یہ کلیے زبان کی فطرت میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کچھ زمانے وہ اصل کلمات کے پہلو بہ پہلو استعمال ہوتے

ہے۔ اس کے بعد نہیں دس نکالا گیا۔ اس کی مثالیں میں اوپر کہیں درج کر آیا ہوں۔ فعل حال 'کرے ہے'، 'پڑھے ہے'۔ اردو میں برج سے آیا۔ 'کرتا ہے'، 'پڑھتا ہے' اردو ہے۔ برج نے اس سے 'کرت ہے'، 'پڑھت ہے'، یا 'کرتو ہے'، 'پڑھتو ہے' بنایا۔

اردو کی طرح اور بھی کئی زبانیں ہیں جو دو زبانوں کے مابین واقع ہونے کی وجہ سے بین بین حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں کچھ خصوصیات ایک زبان کی ہیں اور کچھ دوسری کی۔ ان مشترک خصوصیات کی وجہ سے ان زبانوں کو مخلوط اور دونوں طرف کی زبانوں سے مرکب قرار نہیں دیا گیا۔ اودھی زبانوں کے مشرقی گروہ اور مغربی گروہ کے درمیان واقع ہے۔ مغربی گروہ کی زبانوں کی طرح ماضی مطلق "ت"، "ا" یا "ت"، "ذ" سے مشتق ہے اور مشرق کی زبانوں کی طرح فعل مستقبل "ب" کے اضافے سے۔ اردو پر قیاس کر کے کہا جا سکتا ہے کہ اودھی مخلوط زبان ہے۔ اس کی گرامر نے مشرق و مغرب کی زبانوں سے خوشہ چینی کی۔ وہ کسی مخصوص زبان سے ترقی پا کر نہیں بنی۔ اودھی اور اردو میں اس لحاظ سے کیا فرق ہے اور کس لئے محض اُردو کو مخلوط زبان بتایا جاتا ہے۔

اردو برج سے ماخوذ ہے۔ یہ نظریہ سب سے پہلے ڈاکٹر ہیورنلے نے پیش کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی نشر و اشاعت کی۔ مولانا شیرانی مرحوم کی قابل قدر کتاب "پنجاب میں اردو" کی اشاعت سے پہلے یہ نظریہ عام طور سے صحیح سمجھا جاتا تھا اور ہر شخص جسے اردو زبان سے دلچسپی ہے اس پر اعتقاد رکھتا تھا۔ مولانا شیرانی کی کتاب ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مفصل طور پر اور بڑے مدلل انداز میں اس نظریے کا رد کر دیا گیا تھا۔ لیکن مولانا آزاد کے قلم کا جادو اور انداز بیان کا اعجاز تھا کہ لوگ اس کے بعد بھی یہی کہتے رہے کہ اردو برج کی بیٹی ہے۔ اس نے برج کے بطن سے جنم لیا۔ ۱۹۲۸ء کے بعد اردو اور ہندی میں چھوٹے بڑے رسالے اور صدارتی خطبے شائع ہوئے جن میں اُردو کی ابتدا اور اس کی اصل سے بحث کی گئی تھی۔ مستقل تصانیف میں بھی ضمناً اردو کے آغاز کا ذکر آیا۔ سب نے اُردو

کی اصل برج کو ٹھہرایا۔ رام چندر شکل کے بیان کے مطابق ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر نے ۱۹۲۰ء میں بیانگ دہل اس امر کا اعلان کیا کہ اردو برج کے بطن سے ہے۔ مسلمانوں نے اسے نوک پلک سے درست کیا۔ اردو میں بھی بزرگوں نے یہ غلط فہمی پھیلائی۔ ان میں زیادہ تر وہ اہل علم تھے جنھیں زبانوں کے مزاج، ان کے تغیر و تبدل، یا تنوع کی تلاش میں درک نہ تھا۔ مولانا آزاد کی تقلید میں وہ اردو کا جوڑ برج بھاشا سے لگاتے رہے لیکن جو لوگ اردو اور برج دونوں کے مزاج سے باخبر تھے انھوں نے مولانا شیرانی مرحوم کی کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی مولانا آزاد کے اس دعوے کو ماننے سے انکار کر دیا کہ اردو برج کی بیٹی ہے۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب "اردو ادب" کی تاریخ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے اردو کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

"یہ کہنا بھی کسی قدر غلط ہے جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ اردو براہ راست مغربی ہندی کی شاخ برج بھاشا سے نکلی۔ برج بھاشا اگرچہ اس بولی سے بہت قریب ہے جو دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اور دونوں میں قاعدے کی مشابہتیں بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ دہلی کی بولی سے مختلف ہے۔ یہ متھرا اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ اردو اس کی بہن کھڑی بولی کے بطن سے پیدا ہوئی۔"[1]

گراہم بیلی نے مولانا آزاد کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی سے متاثر ہو کر ہی اس کی تشریح کی تھی[2]

"قدیم کھڑی بولی اردو کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کا برج سے براہ راست کوئی رشتہ نہیں"

یہ عجیب بات ہے کہ اردو کی ابتدا کے بارے میں اردو میں دو نظریے بلند

---

[1] تاریخ ادب اردو (انگریزی) مقدمہ صفحہ ۱۔
[2] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۹۱ ۔

ہم آہنگی کے ساتھ پیش ہوتے اور دونوں پنجاب سے۔ مولانا آزاد نے فرمایا اردو برج سے نکلی۔ اس کے مقابلے میں مولانا شیرانی کی آواز آئی اردو پنجابی کی بیٹی ہے۔ آج یہ نظریے علی الترتیب تبادل صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے۔ سچائی ان دونوں کے درمیان ہے۔ ان میں سے کوئی ایک مزید صحیح ہے۔ برج یا پنجابی ان میں سے کسی ایک سے ارتقا پاکر اردو بنی ہے۔

آیئے ان نظریوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں ان میں سے کونسا صحیح ہے۔ ان کے صرفی، نحوی اور صوتی سرمایہ کے تقابلی مطالعے کے بعد فیصلہ کریں کہ اردو کا ان زبانوں سے کیا رشتہ ہے۔ اس لئے کہ زبانوں کا رشتہ، جیساکہ میں نے عرض کیا ان کے صرفی نحوی قواعد و اصول کے تقابلی مطالعے کے بعد ہی دریافت ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں اردو برج سے بہت قریب ہے۔ یہ قرب اس امر کا ثبوت ہے کہ اُردو اور برج اجنبی نہیں ایک دوسرے کی عزیز ہیں۔ دو زبانوں میں قرب جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی قرابت قریب کی ہوگی۔ لیکن قریب کی قرابت ماں بیٹی ہی میں نہیں۔ دو بہنوں میں بھی ہوتی ہے۔ اس لئے دو زبانوں میں بہت زیادہ مشابہتیں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ماں بیٹیاں ہیں۔ صحیح نہیں۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتوں کی ٹھیک ٹھیک تعیین میں مشابہتیں کام نہیں آتیں، وہ سرمایہ کام آتا ہے جو ان زبانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا، اور ان میں اختلاف پیدا کر کے انہیں آزاد اور مستقل زبانیں بناتا ہے۔

حسب ذیل اصول و نکات میں اردو برج بھاشا سے ممتاز اور مختلف ہے۔

(۱) اردو کے جو اسماء، صفات، نیز افعال 'ا' پر ختم ہوتے ہیں۔ برج میں ان کی جگہ 'او' یا 'و' ہوگا۔ جیسے گھوڑو (گھوڑا)، بڑو (بڑا)، کیو (کیا)۔

(۲) اردو میں مادّے پر 'ا' بڑھانے سے ماضی مطلق صیغہ واحد بنتا ہے۔ برج میں 'یو' بڑھایا جاتا ہے یعنی آخری حرف 'و' سے پہلے 'ی' ہوتی ہے جیسے ماریو (مارا)، بھیڑیو (بھیڑا) وغیرہ۔

(۳) ماضی مطلق کے حرف 'ا' سے پہلے اردو میں فتحہ ہوتا ہے لیکن برج کے 'یو' سے پہلے کا حرف ساکن ہوگا جیسے مارا (اردو) ماریو (برج) چلا (اردو) چلیو (برج)۔

(۴) متعدی بنانے کا طریقہ اردو میں برج سے مختلف ہے۔ اردو میں متعدی کو پہلے 'ا' بڑھا کر بنایا جاتا ہے اور متعدی المتعدی 'وا' بڑھا کر۔ برج میں متعدی 'ا۔ئو' کے اضافے سے بنتا ہے اور متعدی المتعدی 'وا۔ئو' کے اضافے سے

(اردو)	(برج)
کرانا - کروانا	کراؤناں - کرواؤناں
پڑھانا - پڑھوانا	پڑھاؤناں - پڑھواؤناں
بلانا - بلوانا	بلاؤناں - بلواؤناں

مادے کے آخر میں حرف علت ہو تو اردو اس کو 'ل' سے بدل لے گی۔

کھلانا - کھلوانا	(مادہ کھا)	کھواؤناں
دلانا - دلوانا	(مادہ دے)	دواؤناں

(۵) اردو کی ضمیر واحد متکلم (بحالت فاعلی) 'میں' ہے اور برج کی "ہَوں"۔

(۶) اردو کے اسماء مطلقہ (ضمائر، اشارات موصولات) میں غیر فاعلی حالت میں 'س' ہوتا ہے۔ جیسے۔ اُس (وہ) اِس (یہ) جس (جو) تس (تو) جمع کی حالت میں یہ 'س' 'ن' ہو جاتا ہے۔ اُن۔ اِن۔ جن۔ تن۔ برج میں 'ہ' بڑھا دی جاتی ہے۔ جیسے وا (واہی) یا (یاہی) جا (جاہی) کا (کاہی)

(۷) برج میں مفعول کی علامت 'ہ' یا 'ہی' ہے۔ جیسے ہنیو راونہہ رام (راون کو رام نے مارا) برج میں مفعولی ضمیروں، اشارات و موصولات کے آخر میں یہ 'ہ' موجود ہے۔ جیسے موہی (مجھ کو)، توہی (تجھ کو) واہی (اس کو) یہی (اس کو)

(۸) اسماء، ضمائر اور افعال میں برج کا رجحان "ـــ ے"، اور "ـــ و" کی طرف ہے۔

امرد کا نہیں ہے' اور نہ وہ کی طرف کرنے (کرے) کرو (کرو) کریں (کریں) کون (کو) تمہیں (تمہیں) ہمیں (ہمیں)۔

(۹) اردو 'گا' کی مدد سے فعل مستقبل بناتی ہے اور برج 'ہ' کی مدد سے جیسے :-

	اردو (مفرد)	اردو (جمع)	برج (مفرد)	برج (جمع)
متکلم	کروں گا	کریں گے	کریہوں	کریں
حاضر	کرے گا	کرو گے	کرہے	کرہو
غائب	کرے گا	کریں گے	کرہے	کرہیں

(۱۰) برج میں فعل حال کا صیغہ واحد متکلم کروں (واو مجہول) ہے اور اردو میں کروں (واؤ معروف)۔

(۱۱) برج میں جمع کا قاعدہ آسان اور سادہ ہے۔ اسم کے آخر میں 'ن' اضافہ کرلے سے جمع بن جاتی ہے اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ بہت پیچیدہ ہے۔ برج ہاسی برج ہاسین۔ سب۔ سبن۔ گھوڑا۔ گھوڑن۔

(۱۲) برج اردو فعل معاون 'ہوا' کی جگہ، بھیو، اور اس کے صیغے اور 'تھا' کی جگہ 'ہتو' استعمال کرتی ہے۔ جیسے ایسیں سہرا ودھی گائے شری جی کے بھینٹ بھیئیں۔ (ایسی ہزار گائیں شری جی کو بھینٹ ہوئیں)

(۱۳) لاحقہ مصدری اردو میں 'نا' ہے۔ برج میں 'بو' اور 'بوں' جیسے کربوں (کرنا)، چل بو (چلنا)

(۱۴) برج 'سیں' اور 'تے' دو ابتدائی لاحقے استعمال کرتی ہے لیکن اس کا اپنا لاحقہ 'تے' ہے 'سیں' اس نے اردو سے وضع کیا۔

(۱۵) برج اردو سے بچھڑی ہوئی ہے کہ اس میں اسما صفات اور ضمائر کی تصریف باقاعدہ اور منظم نہیں۔ اردو میں نظم و باقاعدگی ہے 'وہ' (ضمیر واحد غائب) فاعلی حالت میں

ہے۔ کوں (علامت مفعول) کے بعد بھی یہ 'ہ' ہی رہتی ہے۔ جیسے 'اوپ لوتی کوں (اس پوتی کو)
جمع کی صورت میں اسم کی تصریف نہیں ہوتی۔ فاعلی اور غیر فاعلی دونوں حالتوں میں وہ یکساں
رہتا ہے۔ جیسے لوگن (لوگ)، لوگن نے (لوگوں نے) لوگن کو (لوگوں کا) وغیرہ۔
(۱۶) اردو میں امر تعظیمی کے دو صیغے ہیں۔ کریئے۔ پڑھیئے۔ کیجیئے پیجیئے (کیجے پیجے)
برج میں یہ ایک ہے۔ کرجے۔ کریجے پڑھجے۔ پڑھیجے۔
(۱۷) برج میں فعل مجہول اردو کی طرح 'جا' کی مدد سے بنایا جاتا ہے۔ لیکن اردو 'جا' اور
اس کے صیغوں میں اضافہ ماضی مطلق (حالیہ تمام) پر کرتی ہے اور برج حالیہ تمام اور ناقص
دونوں پر۔ جیسے پڑھو جائے۔ پڑھیو جائے۔
(۱۸) برج 'تک' کی جگہ اور اس کے معنی میں عام طور سے لوں یا لوں استعمال کرتی ہے
ڈاکٹر گریرسن نے برج کی حسب ذیل صوتی خصوصیات بتائی ہیں جو اسے اردو
سے ممتاز بناتی ہیں:۔
(۱) 'ر' اگر حرف صحیح سے پہلے ہو تو گرجاتی ہے اور حرف صحیح مشدد ہو جاتا ہے جیسے
مدّ (مرد) مّجا (مرجا)، مثّوں (مرت ہوں)، لوکّن سوں (لوکرن سوں)۔
(۲) 'و' کی آواز متعین نہیں۔ 'واو' اور 'ب' کے درمیان اس کا تلفظ ہوتا ہے۔ لیکن
طویل حرف علت کے بعد 'و' 'م' سے بدل جاتا ہے۔ جیسے بامن (باون)، مہاں
(وہاں) آمت (آوت سے = آتا ہے) سامن (ساون)
(۳) ہائیہ حروف کی 'ہ' اکثر حذف ہو جاتی ہے۔ جیسے۔ اول (ہوں)، اسے (ہے)،
ئیں (رہیں) اُو (ہو = تھا)
اس کے علاوہ برج کی دو ایک صرفی نحوی امتیازی صفات کی طرف بھی اکثر
گریرسن نے توجہ دلائی ہے:۔
(۱) رشتے ظاہر کرنے والے اسمائے جو فاعلی حالت میں الف پر ختم ہوتے ہیں غیر

فاعلی حالت میں حسب قاعدہ منصرف نہیں ہوتے یا یوں کہئے کہ 'ے' کی جگہ راجستھانی کی طرح غیر فاعلی حالت میں ان کے آخر میں 'ا' ہوتا ہے۔ جیسے ملو ہرے بیٹلنے (چھپٹے بیٹے ٹے نے)[ل]۔

(۲) برج میں فعل حال بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مادے کے آخر میں 'ے' بڑھا کر 'ہے' اور اس کے صیغے: اضافہ کر دیتے ہیں۔ مارتے ہوں (مارتا ہوں) مارتے ہے (مارتا ہے)، مارتے ہیں (مارتے ہیں)، 'مارنے' میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

(۳) 'نے' فعل ماضی لازم کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لوہرے بیٹلنے چلیو (چھپٹے بیٹے نے چلا = چھوٹا بیٹا چلا)۔

اس فہرست پر جس میں اختصار کے ساتھ اردو اور برج کے لسانی بنیادی اختلافات پیش کئے گئے ہیں ایک نظر ڈالنے کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو برج سے مختلف، آزاد اور مستقل زبان ہے۔ البتہ یہ دکھلانے کے لئے کہ اردو برج سے زیادہ قدیم ہے وہ برج سے ماخوذ نہیں ہو سکتی مذکورہ بالا صرفی و صوتی اصول و قواعد کا جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا اور ان کی تاریخ کی روشنی میں تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

عام طور سے زبان میں صیغوں یا تغیری کلموں کی تکرار اور ان میں تعدد نہیں ہوتا۔ مثلاً 'نا' مصدری لاحقہ ہے، 'گا' استقبالی ہے اور 'کو' مفعولی۔ 'سے' کی مدد سے ابتدا یا وساطت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اردو میں مصدریت، استقبال، مفعولی، اور مجردی حالتیں ان علامات سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بیان کا کوئی طریقہ نہیں

ل۔ مولانا شیرانی اسے تعریف کی غلطی بتلاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں برج میں 'نے' ابھی غیر فاعلی حالت ہے۔ بلکہ عام طور سے 'ا' پر ختم ہونے والے اسما جیسا کہ گریرسن نے لکھا ہے غیر فاعلی حالت میں 'ا' ہی پر ختم ہو سکتے ہیں۔ (جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۷۶)۔

جن زبانوں میں ایک حالت کے اظہار یا صیغے کی تعبیر کے لئے ایک سے زیادہ علامتیں ہیں ان میں سے ایک علامت اس زبان کی ہے باقی دوسری قریب کی زبانوں سے لے کر اپنا لی گئی ہیں۔ انگریزی میں سابقوں اور لاحقوں کی کثرت کی وجہ، جیسا کہ ماہرین لسانیات نے لکھا ہے یہ ہے کہ انگریزی نے دل کھول کر لاطینی، یونانی وغیرہ زبانوں سے استفادہ کیا۔ یہ سابقے و لاحقے ان زبانوں کے ہیں جو اینگلو سیکسن تعمیری کلمات کے دوش بہ دوش انگریزی میں رائج ہیں۔ بے کل اور بڑھل میں 'بے' اور 'ب' (سنسکرت وِ) دو لاحقے ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ "بے" فارسی ہے اور 'ب' ہند آریائی۔ 'نامعقول' اور 'انمول' میں 'نا' فارسی ہے اور 'ان' ہند آریائی۔ یہ اصول بہت واضح ہے، قیاسِ صحیح اس کا مؤید ہے، زبانوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ اس لئے مزید توضیح و تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

برج بھاشا میں ایک صیغے کی کئی کئی شکلیں ہیں۔ تعمیری کلمے جن کی مدد سے صیغے ڈھالے جاتے ہیں، اسماء و افعال گردانے جاتے ہیں ایک سے زیادہ ہیں ان صیغوں کی چھاپ اور تعمیری لفظوں کی حیثیت کہیں کہیں برج بھاشا کی فطرت اور اس کے مزاج کے منافی یا ناموافق بھی ہے۔ صیغے اور کلمے برج کے کسی قدیم روپ سے تعلق رکھ کر نہیں بنے۔ برج نے پاس پڑوس کی کسی بولی سے مستعار لئے شروع میں میں نے اس قسم کے چند کلمات کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ یہ کلمے برج میں اردو سے گئے۔ اوپر اردو اور برج کے اختلافات کا جو خاکہ پیش کیا گیا اس میں اس قسم کے کئی صیغے ہیں۔ علامتِ استقبال "گو" اور "نو" مصدری کی بابت جن کا استعمال برج میں دیکھا گیا ہے مولانا شیرانی فرماتے ہیں[1] کہ یہ برج کی ملکیت نہیں۔ برج نے اردو سے لیئے۔ ڈاکٹر سیورنلے لکھتے ہیں[2]

---

[1] پنجاب میں اردو طبع دوم صفحہ ۱۵۰ [2] گوڑین گرامر مقدمہ صفحہ ۰ ۔

"برج میں جہاں کسی صیغے کے دو روپ ہیں ان میں سے ایک اُردو نے اختیار کرلیا۔ برج میں کرَہُوں۔ کروں گو فعل مستقبل (صیغہ واحد متکلم) کے دو صیغے تھے۔ اُردو نے ان میں سے دوسرا پسند کیا اور اسے کروں گا بنالیا اس لیے کہ وہ پنجابی کراں گا" کا ہم شکل تھا۔"

یہ قیاس اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے۔ قیاس کے خلاف اس لیے کہ کسی زبان میں جیسا کہ میں نے عرض کیا، کسی صیغے کی تعمیر صرف ایک کلمے سے ہوتی ہے۔ (الّا یہ کہ کسی دوسری زبان سے کوئی کلمہ لے لیا گیا ہو) برج میں 'گو' اور 'ہوں' دو کہاں سے آئے؟ یہ دونوں برج کے نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ایک (ہوں) برج کا ہے۔ 'گو' اردو نے برج سے لیا تھا تو اسے اپنے مزاج اور رجحانِ طبع کے مطابق 'گو' بنالیا تھا (کوں' کی شکل اردو میں 'کو' ہے) گھلتا کیا ضرور تھا۔ جو 'سو' تو وغیرہ 'ے' 'و' پر ختم ہونے والے اشارے اور ضمیریں پہلے ہی اردو میں موجود تھیں 'گو' بھی انہی میں شامل ہو جاتا۔ میرزا خلق کا بیان ہے کہ برج میں مفعول کی کوئی جداگانہ علامت نہیں اسکی بجائے مکسور 'ہ' سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ جیسے راونہ (راون کو) برہمنہ (برہمن کو)۔ رامہ (رام کو) 'کا' کی مدد سے استقبال کا اظہار برج کے تالیفی مزاج کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ کرہوں' 'کروں گو' سے زیادہ قدیم ہے۔ برج کے قدیم ادب میں یہی 'ہوں' استعمال ہوا ہے۔ ملسو پر برج کی چھاپ ہے۔ اس میں 'گو' نہیں دیکھا گیا اس لئے 'گو' برج کے دامن میں نہیں باندھا جا سکتا۔

'میں' کے 'سے' 'کوں' (کو) 'نوں' (نا) 'میں' برج نے اُردو سے لئے اور اپنے مزاج کے مطابق غنّہ بڑھا کر انہیں اپنا لیا سے، ہ، بو اور ہوں' بہ ترتیب لئے 'سے' 'کو' 'نا' اور 'میں' کے قائم مقام ہیں برج کے ہیں۔

برج پر اردو کے اصولی اثرات بھی ہیں۔ 'کرت' ہے 'وغیرہ فعل حال کا ذکر پہلے پر

کرگیا ہوں کہ ان صیغوں کو برج نے اُردو کر تا ہے سے لیا۔ چند اور ملاحظہ ہوں۔

(۱) اسماء کی غیر فعلی حالت برج میں نہ تھی۔ یہ اس نے اردو سے لی۔ اس نے ایک طفلِ نوآموز کی طرح صحیح طور سے وہ اس کو برت نہ سکی۔ برج میں صیغہ جمع کی صرف ایک حالت ہے گھوڑن (فاعلی) گھوڑن نے (غیر فاعلی) ڈاکٹر گریرسن کہتے ہیں[1] متھرا میں تھوڑے وناں یا چھے (تھوڑے دن پیچھے) بولا جاتا ہے۔ یہاں برج بھاشا دن کی جگہ "دناں" زا اجتماعی اثر ہے۔ بعض اسماء صفات اور ضمیریں فاعلی اور غیر فاعلی دونوں حالتوں میں یکساں رہتی ہیں۔ جیسے گھوڑا کوں (بجائے گھوڑے کوں) آہ پوتی کوں (بجائے واپوتی کوں بجائے چھوراکوں (بجائے لہرے چھورے کوں)

(۲) جس مادے پر اختصار ہو برج میں اُسے مکسور آخر ہونا چاہیئے۔ جیسے کر۔ پڑھ۔ چھوڑ۔ کرِ ہوں (کرے گا) کرِ بوں (کرنا) کرِ جاے (کرا جائے)۔ پڑھ ہوں۔ پڑھ بوں۔ پڑھ جاے۔ چھوڑ ہوں چھوڑ جاے۔

اگر مستقبل کو برج نے اس طرح گردانا۔

(متکلم)	کرِ ہوں گو	کریں گے
(حاضر)	کرے گو	کرو گے
(غائب)	کرے گو	کریں گے

پہلی برج نے اپنے مزاج کے مطابق مادے کو کسرہ دے کر اس پر گا نہیں بڑھایا۔ اردو کی تقلید میں "گو" فعل حال (مضارع) پر داخل کیا۔ اردو کی طرح اس کی گردان کی (گو۔ گے۔ گی۔ گا۔ گے) اور لاحقہ کو گردانے کی بجائے فعل کو گردانا حالانکہ استقبالی لاحقے کو مادے پر (جو حقیقت قدیم حالیہ تمام ہے) یا حاصل مصدر پر داخل کر کے وہ کرگیو مہت گو کہہ سکتی تھی جیسا کہ اس نے تالیفی مستقبل

---

[1] لسانیاتی جائزہ جلد ۹ حصہ اول صفحہ ۷۶،

اور حال استمراری کی صورت میں کیا۔

تالیفی مستقبل		حال استمراری	
کرہوں	کرہیں	مارے چھوں	مارے ہیں
کرہے	کرہو	مارے ہے	مارے ہو
کرہے	کرہے	مارے چھے	مارے چھو

ان دونوں میں اصل فعل میں کوئی تغیر نہیں ہوا فعل معاون بدل گیا۔

(۳) حالیہ تمام (اسم مفعول) کی علامت سے پہلے اردو کے سوا مغرب کی تقریباً تمام جدید زبانوں میں کسرہ ملتا ہے مثلاً پنجابی میں 'یا' 'ـے ـے'، سندھی میں ـیے ـئے یا ـوے یا ـب نیپالی میں 'ـے ـے' یا ـبے ـے، یا ـب۔ یہ کسرہ براہوئی کی قدیم ہندی میں جو برج کی ماں ہے 'ـی' 'ـد' یا 'ـیو' کی شکل میں تھا لیکن برج سے غائب ہے۔ برج میں حالیہ تمام علامت 'یو' یا 'یو' ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تعمیر میں اردو اور گجراتی اثرات کو دخل ہے۔ اردو میں حالیہ تمام کی علامت 'ـا، ـے' ہے (چلا گیا۔ وغیرہ) اور گجراتی میں 'یو'۔ برج نے ان کو جوڑ کر "یو" بنایا۔ یہی خود اس امر کی دلیل ہے کہ امر سے پہلے زیر تھا جس کے اثر سے علامت کے ساتھ 'ت' نے (سنسکرت ـت پراکرت ـے ـئے) ی کا روپ اختیار کیا۔[1] اس کے علاوہ فعل مجہول 'پڑھ جائے' (اردو 'پڑھا جائے') میں یہ کسرہ موجود ہے۔ اگرچہ برج میں "پڑھ جائے" کے ساتھ "پڑھیو جائے" بھی ہے لیکن پہلا روپ شاید اس میں زیادہ قدیم ہے۔

برج اور اردو کی خصوصیات ذیل اس امر کی گواہ ہیں کہ اردو کا لسانی سرمایہ

[1] گریرسن نے لکھا ہے: ی کو جیسے طور سے صرف حالیہ تمام میں پاتی ہے، قدیم سنسکرت ـت کا بقیہ ہے اس کے مارچ اس طور پر ہیں سنسکرت 'ماریتہ' پراکرت 'ماریو' 'ماریو' 'ماریو' ہندی 'مار یو' (جلد ۹ حصہ اول صفحہ ۷۳)

خیلی پیچیدہ اور بعض حیثیتوں سے زیادہ قدیم ہے۔ وہ برج سے کسی طرح بھی ماخوذ نہیں ہو سکتا

(۱) اردو میں تعدیہ کی دو قسمیں ہیں بلا واسطہ یعنی لازم کو متعدی بنانا۔ اور بواسطہ یعنی متعدی کو متعدی بنانا۔ تعدیہ کے دو طریقے ہیں:-

(الف) مادے کی درمیانی حرکت کا کھنچنا (اشباع حروف) جیسے کٹ سے کاٹ۔ بندھ سے باندھ۔ پٹ سے پیٹ یا درمیانی (اشباع مجہول ے کی جگہ ے و اور ے کی جگہ ے) جیسے کھنچ سے کھینچ۔ کھل سے کھول۔ چھٹ سے چھوڑ۔ یہ تعدیہ بلا واسطہ ہے

(ب) مادے کے آخر میں "ا" یا "وا" کا اضافہ جیسے کر سے 'کرا' یا 'کروا'۔ پڑھ سے 'پڑھا' یا 'پڑھوا'۔ اُٹھ سے 'اُٹھا' یا 'اُٹھوا'۔ یہ تعدیہ بواسطہ ہے پہلا بیک واسطہ دوسرا بدو واسطہ۔

مادے کے آخر میں 'ا'، 'و'، 'ی' میں سے کوئی حرف نہ ہو تو اس کی جگہ 'ل' ہوگا۔ جیسے کھا سے کھلا۔ کھلوا۔ پی سے پلا۔ پلوا۔ سو سے سلا۔ سلوا۔ جی سے جلا۔ جلوا۔ سی سے سلا۔ سلوا وغیرہ۔

اس کے مقابلے میں برج، جیسا کہ میں نے عرض کیا، "ے او" کے اضافے سے (جو معلول الآخر افعال میں 'واو' ہو جاتا ہے) فعل کو متعدی بناتی ہے۔ جیسے پڑھ سے پڑھاؤ۔ کھا سے کھواؤ۔ دے سے دواؤ۔ دیکھ سے دکھاؤ۔ سیکھ سے سکھاؤ۔

(۲) اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ اتنا پیچیدہ ہے کہ برج کے آسان اور سادہ ترین قاعدے سے اسے کوئی نسبت نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(برج)

(مفرد)	جمع (فاعلی و غیر فاعلی)
گھوڑو	گھوڑن
برج باسی	برج باسین

(اُردو)

مفرد	جمع فاعلی	جمع غیر فاعلی
مرد	مرد	مردوں
گھوڑا	گھوڑے	گھوڑوں

سب	سبن	بلا	بلائیں	بلاؤں
مؤنث	کرسی	کرسیاں	کرسیوں	
	عورت	عورتیں	عورتوں	

(۳) امر تعظیمی برج میں بھی ہے اور اردو میں بھی لیکن اردو کا نظام برج کے مقابلے میں کسی قدر مفصل ہے۔ اردو میں امر تعظیمی کے دو لاحقے ہیں یے۔ جئے (جیے) پہلا ان مادوں کے آخر میں اضافہ کیا جاتا ہے جو حرفِ صحیح یا الف پر ختم ہوں اور دوسرا 'ی' یا 'ؤ' پر ختم ہونے والے مادوں پر۔ جیسے پڑھ سے پڑھیے۔ لکھ سے لکھیے۔ کی سے کیجئے۔ دے سے دیجئے۔ لے سے لیجئے۔ ہو سے ہوجئے۔ برج میں صرف ایک لاحقہ 'جے' ہے جو بلا امتیاز تمام مادوں پر جوڑا جاتا ہے۔ کہیں اصل مادے پر اور کہیں مادے پر 'ی' زائد معروف بڑھ جانے کے بعد جیسے پڑھی جے یا پڑھجے۔ کری جے۔ یا کرجے۔

یہاں اُردو کے ایک رجحان کی وضاحت ضروری ہے۔ اُردو میں دو حروفِ علت یا حرکات کا اجتماع ثقیل اور ناروا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اور مشرقی ہندی میں "اأ" ہے۔ اردو "اأ" کو پسند نہیں کرتی۔ اردو کے جو دو اصول اوپر بیان ہوئے ان میں اُردو کا یہ صوتی رجحان صاف صاف جھلکتا ہے پہلی صورت میں مادے کے آخری ا۔ و۔ ی کی جگہ 'ل' اس لئے آیا کہ مادے کے ان حروف کا لاحقہ کے 'ئے' 'ا' یا 'وا' کے ساتھ اجتماع نہ ہو۔ وہ الگ رہیں۔ تیسری صورت میں 'ل' کا کام 'ج' نے انجام دیا۔ وہ مادے کی 'ی' یا 'ؤ' اور لاحقہ کی 'ئے' کے درمیان ڈٹ گیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں۔ یہ اردو کا مزاج ہے جو برج کی سرشت اور اس کی فطری افتاد کے خلاف ہے۔ اس کا ذکر میں نے اوپر کہیں کیا تھا۔

(۴)

"اُردو اَور پنجابی"

اب تیسرے نظریے کو لیجیے "کہ اردو پنجابی سے ماخوذ ہے"۔ میں اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں مولانا شیرانی مرحوم کی قابل قدر کتاب "پنجاب میں اردو" کی اشاعت کے بعد یہ نظریہ زیادہ زور پکڑ گیا ہے، اور اہل علم مخمصے میں پڑ گئے ہیں کہ:۔

"اردو کی بنیاد وہ بولی ہے، جیسا کہ ہندو عالموں کا خیال ہے، جو دہلی، آگرہ اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی یا ڈاکٹر گراہم بیلی کے خیال کے مطابق اُردو پنجاب کی بولی ٹھولی سے ترقی پاکر بنی ہے[لہ]"

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو و پنجابی کی صوتی، صرفی، نحوی خصوصیات اور لفظی سرمایہ پیش کر کے دکھایا جائے کہ خلقت و فطرت اور مزاج و منہاج کے لحاظ سے اردو پنجابی سے مختلف زبان ہے۔ اردو پنجابی کے اہم بنیادی اختلافات درج ذیل ہیں:۔

(۱) اردو کا 'ن' پنجابی میں لسانی (حلقی) 'ڑ' ہے۔

لہ۔ بلیٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز جلد ۵ صفحہ ۳۷۹

(۲) پنجابی قدیم 'س' کو 'ہ' سے بدل لیتی ہے جیسے۔ ایہا (ایسا) جیہا (جیسا)
ایہ (اس) وَرہ (برس) ورھدا ہے (برستا ہے) سہرا (سسرا) وغیرہ
ذیل کے کلمات کا 'س' پہلے 'ہ' ہوا اس کے بعد پنجابی لہجے کی نذر ہوگیا۔
بی (بیس)، تی (تیس) چالی (چالیس) اُنی (انیس) اکی (اکیس) اِکاٹھ (اکسٹھ)۔
پینٹھ (پینسٹھ)۔ چھیاٹھ (چھیاسٹھ)

(۳) پنجابی 'ہ' کا تلفظ نہیں کرسکتی وہ تنہا 'ہ' اور مخلوط بہا حروف کے ہائیہ
عنصر کو ایک خاص لہجے کے ساتھ ہمزہ (ء) سے بدل لیتی ہے جیسے پُکھ (بھوک)۔
تیئان (دھیان)، ڈگا (ڈھگا)، کوڑا (گھوڑا) وغیرہ۔

(۴) پنجابی کلمات کی درمیانی علت گرا دیتی ہے۔ جیسے ٹُٹنا (ٹوٹنا)، وِک (دیکھ) کھنڈ۔
(کھانڈ) ڈُبنا (ڈوبنا)۔) ہندی الفاظ کی خصوصیت نہیں۔ پنجابی نے اپنے مزاج کے مطابق
فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ عربی کی 'ح' اور 'ع' جن کا تلفظ پنجابی
میں 'الف' سے مشابہ تھا۔ پنجابی کے اس تلفظ کی نذر ہو گئے۔ جیسے بِزتی (بےعزتی)
ملوم (معلوم)، مبوب (محبوب) ٹکید (تاکید)

(۵) پنجابی درمیانی حرفِ علت حذف کر کے اس کے بعد کے حرفِ صحیح کو مشدد
کر لیتی ہے۔ چاہے وہ احادی المقطع یعنی یک جزئے ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسے۔
تِنّ (تین)، اِکّ (ایک)، کَنّ (کان) لَمّ (کام) نَکّ (ناک)، ہتھّ (ہاتھ)

(۶) 'ں' (مغنونہ) کی جگہ پنجابی 'ن' استعمال کرتی ہے۔ ھَن گے (ہیں گے)
ھن گی آں (ہیں گی) ہون گے۔ ھون گی آں (ہوں گے۔ ہوں گی)۔

(۷) ذیل کے کلموں میں پنجابی کا میلان مغنونہ کی طرف ہے۔
یاراں (گیارہ) باراں (بارہ) تیراں (تیرہ) چوداں (چودہ) سولاں (سولہ)

(۸) پنجابی دو یا دو سے زیادہ حرکات (علل) کا اجتماع (HIATUS) گوارا

کرلیتی ہے۔ اردو کو یہ پسند نہیں۔ اُوپر کی مثالوں میں گی آں، اردو کے مزاج کے خلاف ہے وہ "گیاں" کہے گی۔ "گھوڑی آں" اردو میں "گھوڑیاں" ہے۔

(۹) پنجابی نے الف کو ہ سے بدلا اور ہ کو الف سے۔ جیسے ہک (ایک) ہور (اور) ہسوار (اسوار) کرواہے (کرتا ہے) کرہے اور (کہتے ہیں) کرہا آں (کرتا ہوں)

مذکورہ بالا کلمات کا "س" اور "الف" "ہ" سے زیادہ قدیم ہے اس لئے مولانا شیرانی کا یہ فرمانا درست نہیں کہ پنجابی کی "ہ" اردو میں "س" یا "الف" سے بدل گئی

۱۰ پنجابی کا "و" اردو میں عام طور سے "ب" ہو جاتا ہے پنجابی اس باب میں اردو سے نیلی مخالفت پسند ہے۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
وچ	بیچ	وگاڑ	بگاڑ
وس	بس	واسی	باسی
وچارا	بچارا (بے چارہ)	ویاج	بیاج
وجلی	بجلی	ورف	برف

متانی نحوی، اختلافات ملاحظہ ہوں۔

(۱) ماضی مطلق (متعدی) کے فاعل (آلی) پر اردو میں "نے" آتا ہے پنجابی نے اردو سے "نے" کر اسے "نیں" بنایا۔ اس کی تفصیل آئندہ سطروں میں ملاحظہ ہو۔

(۲) علامت مفعول "کو" کی جگہ پنجابی "نوں" استعمال کرتی ہے۔ جنم ساکھی میں ایک دو مقامات کے علاوہ ہر جگہ "نوں" آیا ہے[1]۔

(۳) را۔ ری۔ کا۔ کی کے ہم معنی اضافی لاحقے پنجابی میں ڈا۔ ڈی اور دا۔ دی ہیں۔

(۴) "سے" اردو ہے اس کے پنجابی مترادفات تے۔ توں۔ بھی تھوں وغیرہ ہیں۔

(۵) ظرفیت کے لئے اردو میں "میں" ہے اور پنجابی میں "وچ"۔

---

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۳۶ء صفحہ ۷۱

(۶) ماضی بعید اور ماضی استمراری کی گردان اردو میں 'تھا' کی مدد سے کی جاتی ہے جس کے دو صیغے ہیں۔ تھا (واحد) تھے (جمع)، پنجابی میں 'سی' کی مدد سے اس کی گردان اس طور پر ہے۔

سی۔ سن۔ سیں۔ سو۔ ساں

(۷) اردو میں حالیہ تمام (فعل حال) 'ت' پر ختم ہوتا ہے اور پنجابی میں 'د' پر لیکن پنجابی کے جو مادے 'الف' پر ختم ہوئے ہیں۔ ان میں 'ن' بھی ہے جیسے۔

(پنجابی)	(اُردو)
لکھدا۔ لکھدے	لکھتا۔ لکھتے
پڑھدا۔ پڑھدے	پڑھتا۔ پڑھتے
ہوندا۔ ہوندے	ہوتا۔ ہوتے
آوندا۔ آوندے	آتا۔ آتے
جاوندا۔ جاوندے	جاتا۔ جاتے

(۸) حالیہ تمام (ماضی مطلق) کے آخر میں عام طور سے اردو میں 'ا' ہوتا ہے۔ اور پنجابی میں 'ےآ' جیسے

(پنجابی)	(اُردو)
چلیا	چلا
کہیا۔ آکھیا	کہا
ماریا	مارا

کیتا (کیا) دِتا (دیا)، ستا (ڈالا) خلاف قاعدہ ہیں۔

(۹) فعل حال کے مندرجہ ذیل صیغے اردو صیغوں سے مختلف ہیں۔

(پنجابی)	(اُردو)
(میں) کراں	(میں) کروں
(اسی) کریئے	(ہم) کریں
(تو) کریں	(تو) کرے

یہ فعل حال شرطیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ پنجابی اس فعل پر 'گا' اضافہ کر کے مستقبل کے صیغے وضع کرتی ہے تو واحد اور جمع (متکلم) میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ جیسے میں کراں گا۔ اسی کراں گے۔ اُردو میں حسب قاعدہ یہ صیغے اس طرح ہیں۔ میں کروں گا۔ ہم کریں گے۔

(۱۰) پنجابی، گجراتی اسامہ وارسی کی طرح لاحقہ "سی" کی مدد سے فعل مستقبل بناتی ہے۔ 'گا' اس نے اردو سے لیا۔ جیسے۔ جویں تسی آکسو تویں کراں گے (جیسے تم کہو گے ویسے ہی کریں گے)

(۱۱) غیر فاعلی حالت میں اردو اسما کی جمع 'وں' کے اضافے سے بنتی ہے اور پنجابی میں 'آں' کے اضافے سے جیسے۔

(پنجابی)	(اُردو)
گوڈی آں دا	گھوڑیوں کا
گلاں تے	باتوں سے

جن مؤنث اسمائ کے آخر میں 'ی' ہے پنجابی اُن پر 'ائیاں' بھی بڑھاتی ہے۔ چنگی سے چنگیاں اور چنگیائیاں، نانک کا دوہا ہے:-

چنگیائیاں سہ بانیاں واپے دھرم دوری   کمئی اپو آپنڑیں کے نیڑے کے دوری

(۱۲) بلا کی جمع اردو میں بلائیں (یائے مجہول سے) ہے اور پنجابی میں بلائیں (یائے معروف سے)۔

(۱۳) الف پر ختم ہونے والے اسماء اگر مفرد ہیں تو بصورت منادی ان کے آخر میں اردو میں 'ے' ہوگا۔ جیسے او لڑکے' اور پنجابی میں 'یا' جیسے لوُمنڈیا

(۱۴) اردو کے حسب ذیل اسماء اشارہ کے اول میں 'ی' یا 'و' ہے۔ پنجابی ان کا آغاز 'ا' سے کرتی ہے۔ جیسے یہ (اہ) وہ (اُو) یہاں (ایتھے) وہاں (اُتھے) مشرق کی جدید آریائی زبانوں کی طرح پنجابی کو 'ی' اور 'و' سے کلمے کا آغاز ناپسند ہے۔

(۱۵) پنجابی میں امر حاضر (جمع) کے دو صیغے ہیں۔ کرو۔ کریں (یائے معروف)۔ اردو میں صرف 'کرو' ہے۔

(۱۶) پنجابی اور اردو کی ضمیریں بھی مختلف ہیں۔

(اردو)	(پنجابی)	(اردو)	(پنجابی)
میں۔ ہم	میں۔ اسی (اسیں)	ہمارا	اساڈا
تو۔ تم	تو۔ تسی۔ (تسیں)	تمہارا	تواڈا۔ تساڈا۔

(۱۷) اردو میں مجہول صرف 'جا' کی مدد سے بنتا ہے۔ پنجابی 'جا' کے علاوہ 'ی' لگا کر بھی مجہول بناتی ہے[1]۔ 'آں' اس کی جمع ہے جیسے۔

کبر آجاوے یا کبری اے۔ کبراں۔ کڈھاں۔ چن چن کڈھاں۔ (چن چن کر نکالیں (جنم ساکھی صفحہ ۱۵۳)

(۱۸) اردو عام طور سے مادے پر 'یے' بڑھا کر امر تعظیمی بناتی ہے لیکن 'ی' اور 'ہ' پر ختم ہونے والے مادوں میں 'ے' سے پہلے 'ج' اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے۔ کہیے۔ پڑھیے۔ کیجیے۔ پیجیے۔ دیجیے۔

قدیم پنجابی میں جیسا کہ صیرو نظے نے لکھا ہے 'اَٹُ' یا 'ات' مادے پر اضافہ کرکے تعظیم کا مفہوم پیدا کیا جاتا تھا۔ جیسے کری اَٹُ (کریے) الکھی اَٹُ (لکھیے)

---

[1] ڈاکٹر گریرسن کہتے ہیں اس قسم کا فعل مجہول بجز پنجابی ادب میں بہت کم ملتا ہے (جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۶۱۹)

(۱۹) پنجابی کسی قدر تالیفی زبان ہے۔ اُردو میں کہیں کہیں ظرفی حالت کی علامت (ے) دیکھی گئی ہے (سویرے۔ کنارے وغیرہ) پنجابی میں عام طور سے اس کلاحقے سے کام لیا جاتا ہے۔ جیسے اس دی درگاہے (اس کی درگاہ میں) اس دے گھرے (اس کے گھر میں)۔ حسب ذیل تالیفی لاحقے پنجابی میں مستعمل ہیں۔

۱۔ ـــو ں' (واوٴ مجہول) ابتدائی حالت کے لئے۔ جیسے گھروں (گھر سے)

۲۔ ـــیں۔ (یائے معروف ظرفیت کے لئے۔ جیسے گھریں (گھر میں)

۳۔ ـــیں (یائے معروف) آلی کے لئے۔ اس دے ہتھیں (اس کے ہاتھوں سے)

(۲۰) ماجھے کے علاقے کی پنجابی میں فعل کے ساتھ متصل ضمیریں بھی دیکھی گئی ہیں جیسے آکھس (آکھے آ = کہا۔ اس = اس نے) اس نے کہا۔

(۲۱) بنگالی کی طرح پنجابی میں 'جے' ایک فعل ہے جس کے معنی ہیں 'ہے' جیسے کی جے (کیا ہے) کی آکھے آجے (تم نے کیا کہا) بنگالی زبان میں کہتے ہیں او جے (وہ ہے)

(۲۲) گریرسن نے 'گا' کے علاوہ ایک لاحقہ 'وا' کا ذکر کیا ہے جس کی مدد سے شمالی پنجابی فعل مستقبل بناتی ہے۔ جیسے دساں وا (میں بتاؤں گا یا کہوں گا)

(۲۳) اردو میں اختتام فعل کا اظہار 'گیا' 'بنا' 'چکا' وغیرہ افعال کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جیسے چلا گیا۔ چلتا بنا۔ کھا چکا۔ پنجابی 'رہا' سے یہ کام لیتی ہے۔ جیسے چلدا رہا (چلا گیا) چلدے رہے (چلے گئے) فعل حالی پر 'رہا' داخل کرنے سے اُردو میں استمرار کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ چلتا رہا۔ چلتے رہے۔ وغیرہ۔

(۲۴) پنجابی استمرار کا اظہار 'وا' کی مدد سے کرتی ہے۔ جاندا وداے (جا رہا ہے یا جاتا رہتا ہے) لیکن عام طور سے 'پیا' (پون = پڑنا) سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ آندا پیا۔ پیا آندا (آ رہا ہے)

(۲۵) علامت تعدیہ پنجابی میں 'ے - و' ہے یا 'ے ال' اردو میں 'ے - ا' یا 'ن' یا 'ت' جو دریلسے
چلوونا (چھونا) دکھلانا (دکھلانا) سکھاؤنا (سکھاتا) سکھالنا (سکھلانا) وغیرہ

(۲۶) ذیل کے کلمات و حروف پنجابی کے ساتھ خاص ہیں۔ اردو انہیں نہیں برتتی۔
توڑے۔ تائیں۔ لگ (تک)، کول (پاس) نال (ساتھ) ھنڈ (اب) نیڑے (نزدیک) وانگر، وانگوں (مثل)، بس۔ بھلکٹوں (بلکہ) جے۔ جیکدھان جے کہ (اگر) ول۔ ولا (پھر) اتے (اور) اجنڈ (پھر بھی)، وچا دفق معاون (کیتے (لئے) سوب (دجہ سے) نان (نہیں) وو (طرف) بجادیں (چاہیں) دسنا (بتانا)۔ پیو (باپ) ماؤں (ماں)،

(۲۷) ذیل کے کلمات اردو کلمات سے کسی قدر مختلف ہیں۔
وی (بھی) اینویں (یونہی) اوویں (ووہی) کیویں (کیسے) جیویں (جیسے) تیویں (تیسے) جدوں۔ جداں (جب)، تداں تدھاں (تب) اتھاں (یہاں) اوتھاں (وہاں) کتھاں جتھاں اچانچیت (اچانک) آکھنا (کہنا) ساہ (سانس) تہ (تہہ) (تیزی)۔

اُردو اگر پنجابی سے ماخوذ ہوتی تو اس کی حیثیت پنجابی کی ایک بولی یا شاخ سے زیادہ نہ ہوتی۔ اور یہ قریب قریب طے ہو چکا ہے کہ کسی زبان کی شاخ، جسے اپنی اصل سے بچھڑے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو بنیادی طور پر اصل سے مختلف نہیں ہوتی۔ مولانا شیرانی کے لفظوں میں[1] (برج کی جگہ پنجابی رکھ کر)

"جب ہم اردو کے ڈھول، اس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے۔ اور پنجابی کا رنگ اور۔ دونوں کے قواعد و ضوابط اور اصول مختلف ہیں۔"

اس کے بعد:-

"پنجابی سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے۔ لیکن

[1] پنجاب میں اردو (طبع دوم) صفحہ ۹۳ - ۹۴

جہاں پنجابی سے اس نے الفاظ مستعار لیے ہیں وہاں پنجابی پر اپنا اثر بھی ڈالا ہے۔ اور پنجابی پر کیا موقوف ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں۔"

اردو اور پنجابی کے رشتے کی تعیین تو میں بعد میں کروں گا جہاں اردو کے ماخذ سے بحث کی جائے گی۔ یہاں یہ امر واضح کرتا چلوں کہ اردو اور پنجابی ان تمام لسانی مشابہتوں کے باوجود، جن کا ذکر مولانا محمود شیرانی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کرتے ہیں مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مختلف زبانیں ہیں۔ ان میں اصلی اور نسلی امتیازات ہیں جو ان کے مختلف الاصل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور صاف صاف چغلی کھاتے ہیں کہ یہ زبانیں ایک گھرانے کی نہیں دو گھرانوں کی ہیں ایک نسل کی نہیں دو نسل کی ہیں۔ گریرسن اور ہیورنلے نے جدید آریائی زبانوں کے دو گروہ بتائے ہیں۔ جو دراصل ہند آریائی زبانوں کی دو نسلیں ہیں اندرونی اور بیرونی۔ شمال مغرب کی زبانوں میں سے مغربی پنجابی، سندھی، کشمیری بیرونی نسل کی ہیں اور مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی اندرونی نسل کی[1]۔ گریرسن پنجابی کو اصل و نسل کے اعتبار سے بیرونی خاندان کا ایک فرد بتلاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مغربی پنجابی سے ملتی جلتی کوئی زبان اس علاقے میں رائج تھی جہاں آج پنجابی کا راج ہے۔ پنجاب کے مشرقی گوشہ سے لے کر مغربی گوشے تک یہ ملی جلی اور بڑی حد تک یکساں زبان بولی جاتی تھی۔ کہ اچانک دوآبہ گنگ و جمن کے زیریں علاقے سے موجودہ ہندوستانی (اردو) کی کسی قدیم شکل نے ابھر کر پنجاب پر چھاپہ مارا اور قدیم مغربی پنجابی کو دریائے چناب کے نصف بالائی حصہ سے پیچھے دھکیل کر پنجاب پر قابض ہو گئی۔ پنجابی قدیم ہندوستانی کی اس چیرہ دستی کی پیدا وار ہے۔ یہ داستان گریرسن کے لفظوں میں سنیے[2]۔

---

[1] ملاحظہ فرمایئے مقالہ "کشمیری" میں متصل ضمیمہ جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء صفحہ ۲۲۶

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۶۱۴ -

"پنجاب کے مشرق میں مغربی ہندی کے کئی ہندوستانی روپ ہیں جو دریائے جمنا کے دونوں طرف دوآبہ کے بالائی حصے میں رائج ہیں موجودہ لسانیاتی کیفیات واحوال سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی کے کسی قدیم روپ نے دھیرے دھیرے مشرقی پنجاب کی طرف قدم بڑھایا اور قدیم لہندا (مغربی پنجابی) زبان کو دبئے پنجاب کے نصف بالائی حصہ تک دھکیل کر اس کی جگہ لے لی۔ یا یوں کہیے کہ اس پر چھائی ہندوستانی کا اثر صرف یہیں تک محدود نہیں رہا۔ اس کے آگے بھی اس نے قدم رکھا وہ بڑھتی رہی اور بڑھتی رہی یہاں تک کہ صحرائے تھل نے حائل ہو کر اس کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔"

گریرسن کے اس قیاس کی بنیاد جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، خود پنجابی زبان ہے وہ فرماتے ہیں[1] "پنجابی کی اصل و اساس پر نظر کریں۔ تو وہ بیرونی گروہ کی زبان اور موجودہ لہندا کی قریبی عزیز ہے۔ اس کی اوپری عمارت کو دیکھیں تو وہ مغربی ہندی (قدیم ہندوستانی) کا ایک لہجہ یا بولی معلوم ہوتی ہے۔"

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اساسی طور سے پنجابی اردو سے مختلف ہے۔ اوپر اردو و پنجابی کے لسانی امتیازات کا خاکہ اسی غرض سے پیش کیا گیا۔ گریرسن کا نظریہ اس کا موید ہے۔ سوال یہ ہے کہ اردو اور پنجابی اصل و اساس کے لحاظ سے اگر ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو ان میں سے کوئی ایک دوسری کی اصل کیسے ہوئی؟ آئندہ بحث کو وضاحت کے لئے میں تین بنیادی نقطوں میں سمیٹ لینا چاہتا ہوں پھر اسی ترتیب سے ان پر بحث کروں گا۔

(الف) اردو اصل و نسل کے لحاظ سے پنجابی سے مختلف زبان ہے

(ب) اردو کا اختلافی سرمایہ پنجابی کے سرمایہ سے زیادہ قدیم ہے

(ج) اردو اور پنجابی کا مشترک سرمایہ ان زبانوں کو اپنی اپنی اصل سے ترکے میں ملا

---

[1] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۶۱۵

یا پنجابی نے قدیم ہندوستانی (اردو) سے مستعار لیا۔

ان میں سے پہلے نقطہ کو لیجئے۔ سب سے پہلے میں اردو زبان کی بنیادی خصوصیات کا ذکر کروں گا جن کا خاکہ اس مقالے کی ابتدائی تمہیدی سطروں میں پیش کیا گیا۔ اردو ان خصوصیات کی وجہ سے اردو بنی۔ یہ خصوصیات اسے اپنی اصل سے ورثے میں ملیں۔ اردو کی پاس پڑوس کی زبانوں میں سے کسی زبان میں کوئی خصوصیت پائی جائے تو وہ اردو کی سگی بہن ہوگی۔ اگر اردو کی بہن نہیں تو اس نے یہ خصوصیت اردو سے مستعار لی۔ ان میں سے پانچ جو درج ذیل ہیں اردو اور پنجابی میں مشترک ہیں۔

(۱) مذکر اسما صفات و افعال کے آخر کا 'ا'

(۲) 'نا' علامت مصدر

(۳) 'گا' علامت استقبال۔

(۴) غیر فاعلی حالت میں اسمائے مطلقہ کا 'ں'

(۵) 'نے' علامت آلی فاعل

باقی صفات صرف اردو میں ہیں۔ پنجابی ان سے ناآشنا ہے۔ اس کے علاوہ:-

(۱) پنجابی دو یا دو سے زیادہ حرکات و علل کا اجتماع گوارا کر لیتی ہے۔ اردو کو اس سے سخت نفرت ہے۔ جہاں دو حرکتیں یا دو علتیں کسی کلمے میں جمع ہوئیں اردو نے تسہیل (سندھی) یا ادغام کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے گلے ملا دیا جیسے

کرداں (کرتا ہوں)، گھوڑی آں (گھوڑیاں) کر آ جا وے (کیا جاوے) کری ات (کرے) چل آ (چلا)، اردو کے مزاج کے مطابق بترتیب ان کا تلفظ اس طرح ہوگا۔

کروں (ا + ا = ا) گھوڑیاں (ی + آ = یا) کریا (ـِ + ا = یا) کریت (ی + ا = ی) چلیا (ـِ + آ = یا)۔

(۲) فعل کے ساتھ متصل ضمیروں کا استعمال پنجابی کی فطرت ہے۔ یہ استعمال لہندا

میں زیادہ ہے اور پنجابی میں کم تحلیلی زبان ہونے کی وجہ سے اردو متصل ضمیریں استعمال نہیں کرتی۔

(لہندا)	(پنجابی)	(اردو)
اکھیےاس	آکھی۔اُس	اس نے کہا

آکھی۔اُس مرکب ہے 'آکھی ۔' اور 'اس' سے (اکھیا = کہا۔ اس = اس نے)

(۳) پنجابی تالیفی زبان ہے۔اس کا فعل مستقبل تالیفی ہے۔فعل مجہول ۔ی' کے اضافے سے بنا۔اسما کی گردان میں سے ابتدائی، ظرفی، آلی تین حالتیں حرکات وصل میں تصرف کرکے حاصل کرلی گئیں۔مثالیں اوپر درج ہو چکی ہیں۔

(۴) شروع کلمے میں پنجابی کا رجحان 'و' کی طرف ہے اردو کا 'ب' کی طرف' اس رجحان کے زیر اثر پنجابی نے فارسی 'ب' کو بھی 'و' سے بدل ڈالا۔

(پنجابی)	(اردو)
وچارہ	بچارہ (بے + چارہ)
ورف	برف
وار	بہار

(۵) کلمے کے شروع میں 'الف' کو 'ہ' سے بدلنا (ہور۔ ہک بجائے اور۔ ایک) پنجابی کی بیرونی فطرت کو بے نقاب کرتا ہے اور اسے اردو سے ممتاز بناتا ہے۔

(۶) پنجابی کی نمایاں ترین خصوصیت س کا تشدیدی رجحان ہے۔ یہ رجحان شورسینی میں بھی تھا جسے ہندوستانی کی ماں بتایا جاتا ہے۔اردو کا میلان تخفیف و تسہیل کی طرف ہے اگرچہ اس میں چند کلمے مشدد بھی ہیں۔پنجابی اس باب میں بہت سخت ہے۔ وہ ان کلمات کو بھی جو اصلاً مشدد نہیں درمیانی حرف علت گرا کر مشدد کرلیتی ہے اور اس میں دیسی یا دخیل اور اپنے یا پرائے کا فرق نہیں کرتی۔ مثلاً تین سنسکرت ترینی پر کرت تیمن اصلاً

مشدد نہ تھا پنجابی نے درمیان کی 'ی' گرا کر مشدد بنایا۔ ایک بھی مشدد نہیں۔ 'ی' گرا کر اسے بھی اک بنایا گیا۔ بزتی (بے عزتی)، ملوم (معلوم)، تکید (تاکید)، میوب (معیوب) میں سے 'ی'، 'ع'، 'ا'، 'ح' وغیرہ حروف پنجابی کے اسی رجحان طبع کی نذر ہوئے۔ سودگر (سوداگر)، بزاری (بازاری) کی کیفیت بھی یہی ہے۔

(۷) قدیم ہند آریائی 'س' پنجابی میں 'ہ' ہو جاتا ہے اور اگر آخر میں ہو تو گر جاتا ہے جیسے دا (دہ = دس)، بی (بیہ = بیس)، تی (تیہ = تیس)، چالی۔ آنی۔ اکی وغیرہ۔

(۸) 'س' کی مدد سے فعل مستقبل بنانا پنجابی کی فطرت ہے۔ اندھ ماگدھی اور مہاراشٹری میں یہ 'س'، 'ہ' سے بدل گیا تھا پنجابی نے 'ہ' کی طرف مائل ہونے کے باوجود مستقبل کے 'س' کو برقرار رکھا۔

(۹) جب، کب، تب وغیرہ حروف اردو میں 'ت' سے ہیں پنجابی میں 'د' سے۔ جیسے جدوں، تدوں، کدوں یا جداں، تداں، کداں وغیرہ۔

یہ خصوصیات پنجابی کے ساتھ لہندا میں بھی ہیں۔ لہندا کے باب میں گریرسن کے حوالے سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ اصلاً اردو اور اس کی ہمسر دوسری بولیوں سے مختلف ہے۔ اردو اندرونی گروہ کی زبان ہے لہندا بیرونی گروہ کی اور راجستھانی گجراتی گھرانے سے ہے۔ لہندا سندھی اور مرہٹی گھرانے سے ہے۔ اردو جب اور پنجابی جدوں کے ماخذ بھی جدا جدا ہیں پنجابی جدوں، تدوں، کدوں بترتیب سنسکرت یدا، تدا، کدا سے ماخوذ ہیں اور اردو جب، تب، کب سنسکرت یاوت، تاوت، اور کاوت (یا کیوت) سے، پراکرت میں آخر سے 'ت' گری اور 'ی' 'ج' سے بدلی تو جاؤ۔ تاؤ۔ کاؤ ہوئے ان سے جو، تو اور کو پھر جب، تب، کب۔ دکھنی اردو میں 'جب' 'جو' تھا اور 'تب' 'تو' لگن (جب تک) تو لگن (تب تک) سب رس میں ہے 'جو لگن بشریت اس میں باقی ہے تو لگن تعالیٰ کہنے کی شتابی ہے (صفحہ ۱۰۹) اردو 'تک' اصل میں 'تو لگی' تھا۔ تو لگی = تو لگ = تب تک۔

تمگ = تک = تک اس کے درمیانی صلقے ہیں۔ پنجابی تک کی جگہ توڑ ے۔ تائیں، لگ استعمال کرتی ہے۔

اردو 'دیا' کا ماخذ پنجابی 'دتہ' سے مختلف ہے۔ قدیم زبان میں جیسا کہ ڈاکٹر چیٹرجی نے لکھا ہے[1]۔ 'دا' (دینا) سے حالیہ تمام کے دو صیغے مستعمل تھے۔ دتہ (بتخفیف ت) اور دتہ (بتشدید ت) پہلا اردو 'دیا' کا ماخذ ہے اور دوسرا پنجابی 'دتہ' کا۔ 'د' کا کسرہ کلمہ اول سے لیا گیا ہے۔ صیغہ واحد متکلم فعل حال کے لاحقہ (اں پنجابی اور 'وں' اردو) کا ماخذ بھی ایک نہیں۔ پنجابی لاحقہ پراکرت 'چلامِ' (میں چلوں) سے لیا گیا ہے۔ اور اردو اپ بھرنش 'چلئوں' سے۔ پنجابی 'چلئے' (ہم چلیں) کی اصل اردو 'چلیں' سے مختلف ہے۔ لاحقہ جمع پنجابی میں (غیر فاعلی حالت کے لئے) 'ں' ہے اردو میں 'وں' یہ بھی ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں۔ ان میں سے ہر کلمے کی اصل دوسرے کلمے کی اصل سے جدا اور مختلف ہے۔ اگر اردو پنجابی سے ماخوذ ہوتی تو اہم بنیادی کلمے جو زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں مختلف ماخذوں سے لئے جانے کی بجائے ایک دوسرے سے ماخوذ ہوتے اور اردو کلمہ پنجابی کلمے سے اتنا مختلف نہ ہوتا۔ اسی اساس پر ضمیروں کی بابت گریرسن کی یہ رائے غور کے قابل ہے[2]

"پنجابی اور سندھی ضمیروں کا 'س' پراکرت اور اپ بھرنش کی پیداوار نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی مقامی قسم کی پراکرت سے لیا گیا ہے۔ جو سنسکرت 'سم' اکم 'مہ' یا 'م' کی بجائے 'س' سے بدل لیا کرتی تھی۔"

اب دوسرے نقطے کو لیجئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنجابی میں ایسے عناصر بھی ہیں۔ جو

---

[1] بنگالی آغاز و ارتقاء، صفحہ ۳

[2] گوڈین گرامر صفحہ ۲۸۰

ہند آریائی زبان کے ارتقا کو دیکھتے ہوئے زیادہ قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان سے پنجابی کی قدامت پسندی کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اردو اور پنجابی کے مختلف فیہ سرمایے میں سے اردو نے قدیم صیغوں یا ان کی قدیم شکلوں کو برقرار رکھ کر اس امر کا ثبوت پیش کیا ہے کہ اردو پنجابی سے ماخوذ نہیں۔

(۱) اردو فعل حال 'کرتا ہے، پڑھتا ہے'، کی 'ت' پنجابی 'کردا اے، پڑھدا اے' کی 'د' سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ صیغے سنسکرت حالیہ ناتمام 'کرت، پٹھت' سے ماخوذ ہیں۔ شورسینی پراکرت نے اول اول سنسکرت کی 'ت' کو 'د' سے بدلا۔ یہ صیغے پراکرت سے ہوتے ہوئے پنجابی میں آ گئے۔ پنجابی نے انھیں شورسینی سے لیا۔ اردو نے پراکرت کے کسی قدیم تر روپ سے جو 'ت' کو 'د' سے بدلنے کی روادار نہ تھی۔

(۲) اردو فعل معاون 'ہے' (واحد) اور 'ہیں' (جمع)، سنسکرت مادہ 'بھو' (ہونا) سے تراشے گئے ہیں یا 'اس' (ہونا) سے۔ پہلی صورت میں ان کی 'ہ' اصلی ہے جو 'ب' حذف ہو جانے کے بعد باقی بچ رہی۔ دوسری صورت میں وہ 'س' کا بدل ہے۔ پنجابی 'اے، این' کی 'ہ' گر گئی ہے کسی قدر بعد کی پیداوار ہیں۔

(۳) اوپر عرض کیا گیا کہ پنجابی نے اردو کے بہت سے الفاظ و کلمات کے 'س' کو 'ہ' سے بدل لیا۔ مولانا شیرانی مرحوم، اس بات کو نظر انداز کر کے کہ 'س' اصلی اور قدیم ہے فرماتے ہیں پنجابی کی 'ہ' اردو میں 'س' سے بدل جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل کلمات کا 'س'، 'ہ' سے زیادہ قدیم ہے۔ 'س' پہلے سے موجود تھا وہ 'ہ' کی جگہ کیسے لے سکتا تھا۔

(سنسکرت)	(پراکرت)	(اردو)	(پنجابی)
ورش	برس	برس	ورہ
ونشت	بیسی	بیس	ویہ
وش	بِس	بِس	وہ

شوشرا	سوسرا	سسرا	سنوہرہ
دش	دَس	دس	دہ

لہندا میں ضمائر (جمع حاضر) کی اضافی حالت میں 'س' تھا۔ پنجابی نے اپنے طبعی رجحان کے مطابق اسے بھی 'ہ' سے بدل لیا۔ جیسے 'تساڈا' (لہندا)، 'تہاڈا' (پنجابی)۔

(۴) 'تمہارا' اور 'ہمارا' کی 'ر' کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ پنجابی 'ڈ' سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پنجابی اور مستند لہندا میں آج بھی میرا اور تیرا مستعمل ہیں۔ لہندا کی شمالی اور جنوبی بولیوں نے 'میرا' کو 'میںڈا' بنایا۔ پنجابی نے ہمارا اور تمہارا کو 'ساڈا' اور 'تہاڈا' یا 'تواڈا' کر لیا۔

(۵) 'کا' علامتِ اضافت کی جگہ پنجابی عام طور سے 'دا' استعمال کرتی ہے۔ گریرسن اور سدھیشور ورما کا بیان ہے کہ جنوبی لہندا میں 'کا' بھی دیکھا گیا ہے۔ گریرسن کہتے ہیں کہ 'کا' 'دا' سے زیادہ قدیم ہے اور اغلب یہ ہے کہ وہ اس زبان میں بھی تھا جو کسی قدیم زمانے میں سارے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی تائید مولانا شیرانی کے قول سے ہوتی ہے کہ پنجاب کے بعض شہروں اور بستیوں کا ایک جزو 'کا' ہے۔ اردو نے 'کا' برقرار رکھا۔ پنجابی نے ایک نیا کلمہ 'دا' وضع کر لیا۔

(۶) 'یاراں' پنجابی کے عام مزاج کے خلاف ہے۔ اس کے شروع میں 'ی' ہے اور میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ پنجابی اپنے کلمات کی ابتدا 'ی' سے نہیں کرتی۔ پنجابی نے غالباً یہ کلمہ اردو سے[1] لیا۔ سنسکرت میں یہ ایکادش (ایک + دش) تھا۔ پراکرت نے 'ک' کو 'گ' سے بدلا۔ 'د' پہلے ہی 'ر' کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اس سے 'اگارہ' بنا۔ بنگلہ اور اڑیا میں اس کی شکل یہی ہے۔ اردو نے 'گ' کے بعد 'ی' بڑھا کر 'اگیارہ' بنایا جو الف ساقط ہونے کے بعد 'گیارہ' رہا۔ پنجابی کے سامنے دو راہیں تھیں۔ یا تو وہ 'اگارہ' اختیار کرتی یا

۱۔ گرو ڈین گرامر صفحہ ۲۵۰

مہاراشٹری آآرہ (مصنف کی پاس ہے بقول ڈاکٹر سیونظے[1] ایک طرف 'آآبہ' لیا اور دوسری طرف 'یاراں'، پہلا اس کے مزاج کے مطابق تھا۔ اس کا امکان کم ہے کہ اس نے سندھی کی تقلید میں 'آآرہ' کے دوسرے الف کو الف اول کے زیر کی مناسبت سے 'ی' بنا لیا۔ اس لئے کہ پنجابی عام طور سے دو حرکتوں یا علتوں کو اجتماع گوارا کر لیتی ہے اب صرف یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ گیارہ کا 'گ' گرا تو یاراں ہوا۔ باراں (بارہ) کے شروع کی 'ب' بھی گر چکی ہے۔

اب میں اردو اور پنجابی کے مشترک سرمایہ کو لیتا ہوں۔ یہ سرمایہ دو قسم کا ہے۔ ایک وہ ہے جس کا ذکر مولانا شیرانی کرتے ہیں۔ مولانا نے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا کہ یہ سرمایہ پنجابی کا ہے۔ اردو نے پنجابی سے لیا۔ پنجابی بھی تو آخر کسی قدیم زبان سے ارتقا پاتی ہے۔ اگر یہ سرمایہ پنجابی کا ہے تو اسے اپنی اصل یا ماخذ سے ملا ہوگا۔ کیا اردو اس قدیم زبان سے ترقی پا کر نہیں بن سکتی؟ کیا یہ سرمایہ پنجابی کی طرح اردو کو اس زبان سے ترکے میں نہیں مل سکتا؟ جب تک یہ طے نہ ہو کہ یہ تمام سرمایہ جو اردو اور پنجابی کے مابین مشترک ہے اردو نے پنجابی سے لیا خود اردو کے پاس نہ تھا۔ اس وقت تک مولانا شیرانی مرحوم کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا میں اس سرمایہ کو نہ اردو کی ملکیت سمجھتا ہوں نہ پنجابی کی۔ میرے خیال میں یہ ان زبانوں کو ان کی اصل سے ترکے میں ملا۔ اس پر اردو کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا پنجابی کا اس کیلئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ پراکرت اور اپ بھرنش کا تاریخی مطالعہ کافی ہے یہ سرمایہ اپنی موجودہ شکل میں یا کسی قدر بدلے ہوئے روپ میں جستجو کرنے والے کو پراکرت یا اپ بھرنش میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ مولانا شیرانی مرحوم کی بحث کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں پنجابی اور اردو کے اوپر کے انتقائی دور کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جب تک زبان کی پوری تاریخ سامنے نہ ہو اس کا کسی دوسری زبان سے رشتہ دریافت کرنا ناممکن ہے۔

---

[1] سندھی و مراٹھی بھی اسے دخیل بناتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۹۲۰ء ص ۸۳

مشترک سرمایے کی دوسری قسم کا ذکر میں اوپر کی سطروں میں کرچکا ہوں۔ یہ سرمایہ اُردو کی امتیازی خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں سے ذیل کی صفات پنجابی نے اُردو سے لیں :-

(۱) 'گا' علامتِ استقبال اردو ہے۔ لہندا، گجراتی اور مارواڑی کی طرح پنجابی قدیم سے 'سی' لگا کر فعل مستقبل بناتی رہی ہے۔ قدیم پنجابی کے نمونے آو گرنتھ میں ملتے ہیں۔ ان میں 'گا' کے ساتھ 'سی' بھی استعمال ہوا ہے۔ مقبل کی نظم ہیر رانجھا میں جو بقول بنارسی داس جین محمد شاہ کے عہد میں لکھی گئی، عام طور سے 'سی' دیکھا گیا ہے۔ صرف ایک صفحے پر حسب ذیل آٹھ صیغے ہیں۔

جاؤسان۔ بہاؤسان۔ بجاؤسان۔ پاؤسان۔ لیاؤسان۔ پاؤسان۔ آؤسان۔
ستاؤسان۔ مقبل نے فارسی و عربی مصادر پر بھی 'سی' داخل کیا ہے۔

جے توں جوگی نوں سد کے کریں راضی صحت بخش سی رب اللہ تینوں
ہیر کھوہ کے دیہہ توں راوے نوں مقبل بخش سی رب گناہ تینوں

گریرسن وغیرہ علماء السانیات پنجابی کو بیرونی گروہ کی زبان بتاتے ہیں۔ ان زبانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اعرابی اور تعریفی لاحقے اصل کلمے سے جدا نہیں ہوتے وہ اس کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ لہندا کی طرح فعل مستقبل کا اتصالی لاحقہ 'سی' کی مدد سے گویا پنجابی کی فطرت ہے۔ 'گا' انفصالی لاحقہ ہے یہ اس نے اردو کے قدیم روپ سے مستعار لیا۔ 'گا' نے آہستہ آہستہ 'سی' کو نکال باہر کیا۔ برج پر بحث کرتے ہوئے میں لکھ آیا ہوں کہ کسی زبان میں دو دہرے صیغے نہیں ہوتے الا یہ کہ ان میں سے ایک دوسری زبان سے لیا گیا ہو۔ اس قاعدے سے بھی 'سی' اور 'گا' دونوں پنجابی نہ ہوں گے۔ پنجابی کی فطرت کا تقاضا ہے کہ 'سی' اس کا ہو۔ اور 'گا' کسی دوسری زبان کا اور اردو کے سوا کوئی زبان نہیں جس کے دامن میں اسے باندھا جا سکے۔

(۱) 'نا' علامتِ مصدر اگرچہ پنجابی میں بکثرت مستعمل ہے لیکن اس کے کئی قرینے ہیں کہ یہ پنجابی نہیں۔ ایک تو پنجابی میں 'نا' کے پہلو بہ پہلو 'ن' بھی ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ دو صورتوں میں سے صرف ایک اصلی یا ذاتی ہوتا ہے۔ دوسرے تصریف کی صورت میں پنجابی 'نا' کی جگہ 'ن' استعمال کرتی ہے۔ جیسے:-

(پنجابی)	(اردو)
کرن والا	کرنے والا
کہن لگیا	کہنے لگا
مارن لگیا	مارنے لگا۔
بولن نہ پایا	بولنے نہ پایا۔

اگر 'نا' پنجابی ہوتا تو اردو کی طرح بصورتِ تصریف اس کا استعمال عام ہوتا۔ پنجابی نے غالباً 'ن' پر الف بعد میں الف پر ختم ہونے والے اسما کو دیکھ کر اضافہ کیا یا اردو کی دیکھا دیکھی 'ن' 'کرنا' بنایا۔ مولانا شیرانی پنجابی سے 'نا' کی تصریف کی جو مثالیں پیش فرماتے ہیں وہ شاذ ہیں اور ان پر اردو کا اثر بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ "پنجابی میں زیادہ رائج طریقہ یہ ہے کہ مصدر کے آخری الف کو اسی مطلب سے گرا دیا جاتا ہے[1]۔"

(۲) مذکر اسماء و صفات کے آخری حرف کو بیمز نے نے 'کسی قدر پنجابی' قرار دے کر لکھا تھا کہ اردو نے اسے پنجابی سے لیا[2]۔ گریرسن کی رائے میں[3] اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں یہ بیرونی گروہ کی زبانوں سے آیا۔ ہیم چندر کے مندرجہ ذیل مصرعے میں:-

ڈھولا مَیں تُم وارِیا ماکُرُ دیہا مانو۔

(دولہا میں تم پر واری زیادہ نخرے نہ کرو)

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۲۵

[2] گرامر مقدمہ صفحہ ۷

[3] "ہند آریائی بولیاں" بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن جلد ۸ صفحہ ۵۴۳۔

ڈھولا (دولہا)، وا (آروار)، دیہا (طویل۔ زیادہ) اسما و صفات "الف" پر ختم ہوتے ہیں۔ شیام سندر داس لکھتے ہیں "معلوم نہیں یہ پے شاچی اپ بھرنش کا روپ ہے یا کسی اور کا۔ ہیم چندر نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن پنجابی میں "ـُ ـ ا" پر ختم ہونے والے روپ ملتے ہیں اس لئے ممکن ہے یہ کسی۔ پے شاچی اپ بھرنش کا روپ ہو"[1]

اس سلسلے میں کئی باتیں غور کے قابل ہیں۔ گریرسن نے "الف" کو بیرونی گروہ کی زبانوں سے ماخوذ بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرونی گروہ کی زبانوں میں سے مرہٹی اور بنگلا میں بھی یہ الف موجود ہے لیکن اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ اسما و صفات و افعال و حروف ہر جگہ نظر آتا ہے۔ بنگلا کے چند اسما ایسے ہیں جو الف پر ختم ہوتے ہیں۔ عام طور سے بنگلا اسما، صفات و افعال کے آخر میں "ـو یا ـے" ہوتا ہے جیسے

(بنگلا)	(اردو)
بھلو	بھلا
چلو	چلا
جابو	جاؤں گا
چھلو	تھا
پچھیلے	پچھیلا

سندھی بیرونی طبقے کی زبان ہے۔ اس کے باوجود اس کے مذکر اسما "ـُو" پر ختم ہوتے ہیں جیسے گھوڑو۔ بھلو۔ گھوڑو۔ شیام سندر داس کا قیاس کہ "ـُ ـ ا" پنجابی میں ہے اسی لئے یہ پے شاچی اپ بھرنش کا روپ ہے اس صورت میں ٹھیک تھا کہ یہ ـے اکشمیری، دشتا وغیرہ جدید پے شاچی بولیوں میں بھی ہوتا۔ پشتو ہر چند ان میں سے نہیں لیکن ان میں محدود و محصور ہونے کے باعث ان سے قریب ہے۔ پنجابی سے زیادہ

---

[1] ہندی بھاشا اور ساہتیہ۔ صفحہ ۱۴۲

اصحان کا اثر لینا چاہیئے۔

ہر چند کہیں کہیں "ے" اسے یہاں مذبعیر ہو جاتی ہے۔ جیسے لگ آ (پشتو) لگ آ (پنجابی) لگا (اردو) لیکن عام طور سے اس کے کلمات "ے" پر ختم ہوئے ہیں۔ جیسے تلے (پشتو) تلا (اردو) سندھی میں یہ لفظ تلوٗ ہے۔

مندرجہ بالا معروضات کے علاوہ ہیم چندر کے یہاں ذیل کا مصرعہ بھی ملا ہے۔

بھلا ہوآج مارآ بہن مہہارا کنت

اس کی تشریح وتحلیل اردو میں اس طرح ہوگی۔ بھلا (بھلا) ہوآ (ہوا) ج (جو) مارآ (مارا) بہن (بہن) مہارا (میرا) کنت (کانت = شوہر) اس میں بھلا۔ ہوآ۔ مارآ۔ جیلا وغیرہ کلمے "ا" پر ختم ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ہیورنلے کا بیان ہے کہ مشہور قواعد نویس ورچی نے ماگدھی پراکرت "ششلے" (ہندی سیار) کا ایک روپ "ششالا" بتایا ہے یہ "ا" ماگدھی میں اسما کی ندائیہ حالت کی علامت تھا۔ ہیورنلے کے خیال میں بعد میں اسے توسیع دے دی گئی اور جدید زبانوں میں عام طور سے یہ اسما کی فاعلی حالت میں برتا جانے لگا۔[1]

بہر حال یہ "ا" ماگدھی پراکرت سے لیا گیا ہو یا پے شاچی سے بیرونی گروہ کی زبانوں کا ہو یا اندرونی گروہ کی زبانوں کا "اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ پنجابی نہیں۔ اردو بھی ہے اور پنجابی بھی ـــــ دونوں سے اس کا برابر کا تعلق ہے۔ اردو اور پنجابی میں اس کے استعمال کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان زبانوں میں یہ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ انہیں اپنی اصل سے ترکے میں ملا ہے۔

(۴) "نے" کے باب میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پنجابی نہیں۔ قدیم پنجابی میں اس کا استعمال نہ تھا۔ سد حیشور ورمانے جنم ساکھی سے حسب ذیل مثالیں اس کی تائید میں پیش کی ہیں۔ اس دِتا (اس نے دیا) تدھ کیتی ان (تو نے کیا ہے) مردانے

[1] گوڈین گرامر صفحات ۳۹، ۴۰

گنواری کھاندی (مردانہ نے گھبرانا شروع کیا) سدھیشور کا بیان ہے کہ کھونی وغیرہ شمالی بولیوں میں 'نے' نہیں دیکھا گیا[۱] مسٹر ٹی بومفورڈ (T-BOMFORD) نے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی اشاعت ۱۸۹۵ء میں مغربی پنجابی کی ایک مختصر گرامر شائع کی تھی اس میں وہ لکھتے ہیں "اردو میں فعل متعدی کی صورت میں 'نے' ضرور ہوگا۔ جیسے میں نے فرمایا (فرمایا کی ایک ہے رہی!) لیکن ملتانی کے باب میں اہل علم کا اختلاف ہے بعض لکھتے ہیں میں فرمایا کافی ہے۔ سیرام پور کی تبلیغی جماعت کے شائع کردہ (۱۸۱۹ء) پنجابی ترجمے میں 'نے' موجود ہے لیکن اضلاع مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں اور ریاست بہاولپور میں اس کا استعمال بہت کم دیکھا گیا ہے[۲] "پنجابی میں 'نے' کے ناہموار اور غیر استوار استعمال کو دیکھ کر شاید ڈاکٹر ہیوز نے مارواڑی لاحقہ مفعول 'نیں' سے نکال کر اس کا جوڑ پنجابی 'نوں' (کو) سے لگایا[۳] یہ کھلا ہوا تکلف ہے، اور اس سے زیادہ تکلف ان کے اس دلچسپ قیاس میں ہے "اردو نے دیکھا کہ پاس پڑوس کی بولیوں میں دو مختلف لاحقے مستعمل ہیں (کو یا کو برج میں اور نیں یا "نے" مارواڑی میں) تو اس نے 'نے' کو فاعل (آلی) کے لئے چن لیا۔ اور 'کو' کو مفعول (اول و ثانی) کے لئے۔ اس طرح اردو اُس خلط و اشتباہ سے محفوظ رہی جو فاعلی، مفعولی اور اضافی حالتوں میں 'نے' کے استعمال سے گجراتی وغیرہ زبانوں میں راہ پا گیا تھا[۴]"

ڈاکٹر گریرسن 'نے' کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ انہیں اس میں شبہ ہی رہا کہ یہ اردو میں مرہٹی زبان سے آیا یا مضافاتِ دہلی کی زبان سے مگر ایسے ان کا رجحان پنجابی کی طرف ہے۔ وہ فرماتے ہیں "ادبی ہندوستانی کا 'نے' دوآبے کے بالائی حصے

---

۱ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۳۶ء ۱۱۳
۲ صفحہ ۲۹۰
۳ گوڈین گرامر مقدمہ صفحہ ۷
۴ گوڈین گرامر صفحہ ۲۱۹

کی ہندوستانی بول چال میں بھی ہے لیکن وہ پنجابی سے مستعار معلوم ہوتا ہے جہاں اس کا استعمال زیادہ کی شکل میں، باقاعدگی اور نظم کے ساتھ ہوا ہے۔ اس نظم و باقاعدگی کا ذکر سدھیشور اور بومفورڈ کے حوالے سے میں اوپر کی سطروں میں کر چکا ہوں۔ مقبل کے ہیر رانجھے کے دو مصرعے ایک ہی مقام سے منتخب کر کے لکھے جا رہے ہیں۔ ان میں بھی 'نے' نہیں۔

رانجھے علی نوں آکھیا ہیر رانجھے کوی سچ پچھان کے مار سانوں
مقبل جیں دکھایا ہے تہندیاں نوں ہووے اس دے نال تعل ہیاں

مزید تفصیل میرے مقالے "نے کی سرگزشت" (مطبوعہ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۶) میں ملاحظہ ہو۔

(۵) اسمائے متعلقہ کی غیر فاعلی حالت کا 'س' اردو اور پنجابی دونوں میں یکساں طور سے استعمال ہوا ہے لیکن اصل میں وہ اردو ہے۔ پنجابی قدیم فطری رجحان کے زیر اثر 'س' کو 'ہ' سے بدل لیتی ہے اس 'س' پر بھی اس نے ہاتھ صاف کیا اور 'اس' کو 'اہ' اور 'جس' کو 'جیہ' بنایا جس۔ کس۔ تس کے پہلو بہ پہلو پنجابی میں جیہ، کیہ، تیہ بھی مستعمل ہیں لیکن عام طور سے پنجابی 'س' ہی استعمال کرتی ہے۔ یہ اردو کا اثر ہے اور یہی اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ یہ 'س' پنجابی میں اردو سے لیا گیا۔ اگر یہ اصلاً پنجابی ہوتا تو "ہ" کی دستبرد سے محفوظ نہ رہتا اور بقول شخصے "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" یہ 'س' بھی کا "ہ" ہو گیا ہوتا۔ فعل مستقبل کا 'س' اس تصریف سے بچ رہا اس لئے کہ گجراتی، اردو، اوڈی وغیرہ پاس پڑوس کی بولیوں میں یہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ پنجابی کے عام رجحان کے مطابق 'س' مشدد ہونا چاہیے۔ سنسکرت میں یہ 'سی' تھا۔ اور پراکرت میں 'سس'۔ پنجابی پراکرت کے مشدد حروف میں تخفیف روا نہیں رکھتی اور کان کو کنّ اور ہاتھ کو ہتّھ کہتی ہے کسّ کا کس اور جسّ کا جس اس نے کیسا گوارا کیا؟ وہ ان پر پابندیِ تشدید جاری نہ کر سکی؟

بھاکا میں یہ کلمے اس کے مزاج کے مطابق 'جاسو' اور 'تاسو' ہیں۔ یہاں ان پر عمل تخفیف (بحذف س، و تسہیل (باشباع حرکت حرف اول) جاری ہوا۔ آ۔ جاسو میں جس جاس ہے اور تس تاس۔ جیسے[1]

تاس راج سمیپم۔ رسمل نٹ وِدیا اُچارم

(اس راجہ کے قریب علم رقص سیکھنے کے لئے رہتا ہوں)

لہندا میں 'س' نہیں ملتا پنجابی اردو کے قریب تھی اس لئے وہاں تو پہنچ گیا لہندا کے حدود تک اس کی رسائی نہ ہو سکی۔

پنجابی اور اردو کے مختلف فیہ سرمایہ میں سے اسعد سرمایہ کی قدامت اردو کو پنجابی سے مختلف زبان ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس پر مشترک سرمایہ کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ اردو سے پنجابی میں منتقل ہوا۔ اس کے بعد پنجابی کو اردو کی اصل قرار دینا کہاں تک صحیح ہے اس کا فیصلہ خود قارئین فرمائیں۔ گریرسن پنجابی کو ایک طرح کی رلی ملی زبان بتلاتے ہیں جس کا ایک اہم حصہ قدیم اردو سے ماخوذ ہے۔ ان کے الفاظ غور کے قابل ہیں[2]۔

"پنجابی ایک ایسی زبان ہے جسے مغربی ہندی اور لہندا و سندھی کے درمیان کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک رلی ملی اور مخلوط زبان ہے۔"

۱؎ بحوالہ گوڈین گرامر حاشیہ صفحہ ۴۴

۲؎ بلیٹن، سکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد اول صفحہ ۵۵۔

(۵)

"مولد و منشا"

مولانا شیرانی فرماتے ہیں[1]:

"جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے نہ وہ برج ہے اور نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔"

ڈاکٹر سدھیشور ورما لکھتے ہیں[2]:

"ہندی یا اردو دہلی اور میرٹھ کے قرب و جوار میں بولی جاتی تھی۔"

رام بابو سکسینہ کا ارشاد ہے[3]:

"اردو اصل و ماخذ کے اعتبار سے مغربی ہندی کی شاخ ہے جو دہلی اور میرٹھ کے نواح میں صدیوں تک بولی جاتی رہی ہے۔ اور جو شورسینی پراکرت سے ترقی پاکر بنی ہے۔"

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر گریرسن کی تحقیق کے مطابق[4]:

---

[1] پنجاب میں اردو (مقدمہ) صفحہ ۳

[2] ہند آریائی زبانیں صفحہ ۲

[3] تاریخ ادب اردو (مقدمہ) صفحہ ۱

[4] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد اول صفحہ ۱۔

"ہندوستانی قدیم ہندی کی شاخ ہے۔ یہ (ہندوستانی) دوآبۂ گنگ و جمن کے بالائی حصے کی بولی ہے جو مغلوں کے ابتدائی عہد میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے اسے ہندوستان کے گوشے گوشے میں اپنے ساتھ لے گئیں۔"

قدیم مغربی ہندی کے باب میں چٹرجی فرماتے ہیں[1]:-

"مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں۔ ایک طرف برج بھاکا، قنوجی اور بندیلی ہے۔ دوسری طرف بول چال کی ہندوستانی (میرٹھ قسمت روہیل کھنڈ اور ضلع انبالہ) بانگرو یا ہریانی (دہلی، روہتک، حصار، پٹیالہ)۔"

برج بھاکا، بندیلی، قنوجی، ہندوستانی میں فرق کرنے اور یہ دکھلانے کے بعد کہ ہندوستانی اور ہریانی "آ" والی بولیاں ہیں اور برج، قنوجی، بندیلی "او" یا "و" والی، چٹرجی ارشاد فرماتے ہیں[2]:-

"نئی زبان کی بنیاد جو دہلی میں بڑھی اور پروان چڑھی "آ" والی بولی پر قائم ہے۔ اس سوال پر مزید بحث غیر ضروری معلوم ہوتی ہے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شمالی ہند کی زبان کا ایک نیا روپ، جس کی بنیادیں مشرقی پنجاب اور یوپی کے مغربی اضلاع کی بولیوں پر استوار ہوئی تھیں، دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد ابھر کر نمایاں ہوا۔"

شمالی ہند کی زبان کا یہ نیا روپ اردو ہے۔ چٹرجی اس کی بنیاد ہریانی اور یوپی کے مغربی اضلاع کی ہندوستانی پر رکھتے ہیں۔ ہریانی ہندوستانی سے الگ زبان نہیں وہ اس کی ایک شاخ ہے۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں[3]:-

"ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں شاید

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی اول صفحہ ۱۷۱

[2] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۷۱ [3] پنجاب میں اردو (مقدمہ) صفحہ ۱۱

اردو سے اتنی مختلف نہ تھی جس قدر کہ آج دیکھی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانۂ ما بعد میں جب کہ ہریانی اپنی اصلی حالت پہ قائم رہی اُردو میں دہلی کے محاورے اور شعرا کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوگئے۔ موجودہ اردو اسی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے ؎

گریرسن ہریانی کو ایک طرح کی مخلوط زبان بتلاتے ہیں ؎۔

یہ ملی جلی بولی ہے۔ اس میں کچھ حصہ ہندی (ہندوستانی) کا ہے۔ کچھ پنجابی کا اور کچھ راجستھانی کا[1]

ملی جلی زبان پر اردو کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔ امیر خسرو، ابوالفضل، شیخ بہاؤالدین باجن نے اسے دہلوی کہا۔ ہندو اہلِ علم عام طور سے برج 'قنوجی' بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز کے لیے جو اس وقت پڑی بولی کہلاتی تھیں کھڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔ زبان بنیادی طور سے وہی رہی جو آج ہے۔ اس کے نام ایک سے زیادہ تجویز ہوئے۔ ناموں کی کثرت یا تنوع کی وجہ سے اہلِ علم کو اس کی شخصیت میں شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں نے شروع میں اس کی تعیین مناسب سمجھی اور روشِ عام سے ہٹ کر بحث کا یہ انداز اختیار کیا کہ موجودہ اردو کو لے کر سوال اٹھایا کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ کب پیدا ہوئی اور کس مقام سے اس نے نشو و نما پایا؟

ہری اودھ فرماتے ہیں[2]

پشچمی (مغربی) ہندی کا ایک روپ وہ شُدھ (خالص) ہندی (اردو) کہا جاتا ہے

---

[1] بلٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۵ صفحہ ۳۰۵

[2] ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس صفحہ ۴۵

جو میرٹھ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی ہے۔ اس کو ہندوستانی کہتے ہیں"

ان اقوال سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے:۔

(۱) اردو، ہندی، ہندوستانی، دہلوی ایک زبان کے کئی نام ہیں۔

(۲) یہ زبان کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

(۳) کھڑی دہلی اور میرٹھ کی زبان ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔

(۴) کھڑی بولی مغربی ہندی کی شاخ ہے۔

(۵) مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے نکلی جو کبھی دوآبہ گنگ وجمن کے زرخیز علاقے میں بولی جاتی تھی۔

وضاحت کے لیے ان نتائج کو اس طرح پیش کریں تو بہتر ہے۔

اردو = ہندوستانی = مغربی اپ بھرنش = شورسینی پراکرت = قدیم پراکرت۔

ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ اردو اس کی ادبی شکل ہے۔ اس زبان کو یہ نام بعد میں اس وقت دیا گیا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں بول چال کی زبان سے ترقی کر کے اس نے ادب و شعر کی زبان کا درجہ پایا۔ مسلمانوں کے ہمرکاب یہ زبان دہلی سے نکل کر ملک کے دور دراز حصوں تک پہنچی۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کا اقتدار بڑھا اور اس کی حدیں وسیع ہوئیں۔ لوگ بھول گئے کہ کبھی یہ زبان ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود تھی۔ اس سے پہلے پالی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اردو کی طرح وہ بھی اپنے مولد سے نکل کر برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچی اور ایک علمی ادبی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے سارے ملک پر چھا گئی۔

ڈاکٹر چٹرجی اردو کے مولد و مسکن کے باب میں اہل علم کے اختلافات کا ذکر کرتے

ہوئے لکھتے ہیں[۱]۔ ہاں کتاب میں آج تک طے نہ ہو سکا کہ وہ بہار کی زبان ہے یا بلائی دوآبے کی۔

اردو میرٹھ اور دہلی کی زبان ہے اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں مولانا محمود خاں شیرانی کو بھی ماننا پڑا کہ اردو جس زبان سے ارتقا پائی ہے۔ وہ دہلی اور میرٹھ، کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ زبان کا مولد وہی ہوتا ہے۔ جہاں وہ بلا شرکت غیرے بولی جائے پنجاب، اودھ، دکن، بہار، گجرات، بمبئی، وسط ہند جہاں کہیں اردو کا سکہ چلتا ہے اردو کے پہلو بہ پہلو دوسری زبانیں بھی ہیں۔ کہیں اردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے بول چال کی زبانیں اور ہیں۔ کہیں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ کہیں شہر کی زبان اردو ہے دیہات کے باشندے مقامی زبان بولتے ہیں لیکن یوپی کے مغربی اضلاع میں اردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں۔ صرف اردو ہے جو شہروں اور دیہاتوں میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ یوپی کے مغربی اضلاع میں ہندو مسلمان سب اردو بولتے ہیں۔ وہ ہندو کی زبان بھی ہے اور مسلمان کی بھی۔ دوسرے مقامات میں وہ صرف مسلمان کی زبان ہے۔ مسلمان اردو بولتے ہیں۔ ہندو مقامی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً تامل کے علاقے میں مسلمانوں کے گھروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ بازار اور ہاٹ میں بدستور تامل کا سکہ چلتا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں یا اس سے کچھ پہلے اردو کے خط و خال ابھرے یا یوں کہیے اردو نے قدیم مغربی ہندی سے ترقی پاکر موجودہ روپ اختیار کیا۔ قدیم مغربی ہندی کون سی زبان ہے اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کا جواب آسان نہیں۔ اردو، برج، ہریانی، قنوجی، بندیلی آج جہاں بولی جاتی ہیں دسویں صدی عیسوی میں یہ پورا علاقہ کسی ایک زبان کے تصرف میں تھا۔ یہ زبان ان بولیوں کے حدود میں رائج تھی۔ اگرچہ یہ کہنا

[۱] ملاحظہ فرمائیے خطبہ صدارت کل ہند اورینٹل کانفرنس ۱۹۴۳ء

مشکل ہے کہ اس زبان میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا ہر لحاظ سے وہ واحد اور یکساں تھی لیکن اس میں اتنا اور اس حد کا اختلاف نہ تھا جتنا کہ آج ان بولیوں میں ہے جو اس زبان سے متفرع ہوئیں۔ یہ زبان بدلتی رہی، اس کے اختلافات جو کسی زمانے میں معمولی اور غیر اہم تھے شدید سے شدید تر ہوتے رہے اور گیارہویں صدی عیسوی کے آتے آتے اتنے نمایاں ہو گئے کہ وہ پانچ بولیوں میں بٹ گئی۔ اس قدیم زبان کو جو دسویں صدی عیسوی میں اردو اور اس کی ہمسر بولیوں میں منقسم ہوئی قدیم ہندی کہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس اس زبان کی کوئی تحریری دستاویز نہیں جس کی مدد سے ہم بتا سکیں کہ اس کی لسانی خصوصیات کیا ہیں اور یہ اپنی پانچ بولیوں میں سے کس سے زیادہ قریب ہے۔ عام طور سے چند بردائی کی کتاب ”پرتھی راج راسو“ کی زبان کو قدیم ہندی بتایا جاتا ہے۔ اس میں کئی الجھنیں ہیں۔ ایک تو راسو پوری چند کوی کی نہیں۔ اس کے بہت سے حصے پندرھویں اور سولھویں صدی کی تصنیف ہیں۔ دوسرے اس کی زبان خالص ہندی نہیں۔ اس میں پنجابی، راجستھانی، مغربی اپ بھرنش کی آمیزش بھی ہے۔ تیسرے یہ وہ زبان نہیں جو کبھی برج، اردو وغیرہ میں مشترک تھی۔ اور جس سے یہ بولیاں متفرع ہوئیں۔ یہ قدیم برج ہے۔ برج کی طرح اس کے اسما ’۔و‘ پر ختم ہوتے ہیں۔ اور مصطلحہ ’نہ‘ پر۔ وہ ’سے‘ اور ’ئے‘ کی جگہ ’تے‘ اور ’نے‘ استعمال کرتی ہے۔ ’تے‘ اس میں ’سے‘ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ شیام سندر داس کی رائے میں[1]: ”پرتھوی راج راسو میں برج کے ڈھانچے کا بہت کچھ آبھاس ہے“ ڈاکٹر گریرسن راسو کی زبان قدیم برج بتاتے ہیں[2]۔

ڈاکٹر چٹرجی لکھتے ہیں[3]۔

---

[1] ہندی بھاشا اور اس کا ساہتیہ صفحہ ۲۰

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول

[3] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۰۶

"اس میں بڑی حد تک شبہ کی گنجائش ہے کہ اس نظم (راسو) کے مضامین سچے یا واقعی اور اس کی زبان اصلی یا حقیقی ہے یعنی بارھویں صدی عیسوی کی زبان ہے جب اس نظم کا خالق اور اس کا ممدوح دونوں بقید حیات تھے۔ ہو سکتا ہے اس نظم کا کچھ حصہ چند بردائی کی تصنیف ہو لیکن اس کی زبان بڑی حد تک مسخ ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں[1]۔

"راسو کی زبان زندہ — کسی صوبے میں یا کسی زمانے میں بولی جانے والی زبان نہیں — وہ ایک طرح کی خود ساختہ ادبی زبان ہے جس میں ایک سے زیادہ زبانوں کے، جو کبھی دہلی سے دور دراز مقامات میں بولی جاتی ہوں گی، بہت سے صیغے اور ان کے مختلف روپ شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے اہم عناصر مغربی اپ بھرنش، قدیم مغربی ہندی، راجستھانی اور اس کی مختلف بولیوں اور قدیم پنجابی کے مختلف روپ ہیں جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔"

راسو کی زبان قدیم برج ہے یا خود ساختہ مخلوط ادبی زبان، قدیم مغربی ہندی ہرگز نہیں جسے اردو یا ہندوستانی کی اصل بتایا جاتا ہے۔ جب تک مغربی ہندی کا اصل روپ سامنے نہ ہو، اس کے خط و خال متعین نہ ہوں، اس کی لسانی خصوصیات کی نشان دہی نہ کی جائے ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ہندی دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ اردو اس سے ترقی پا کر بنی۔ میرے خیال میں قدیم مغربی ہندی کا تصور جیسا کہ میں اپنے تحقیقی مقالے میں[2] عرض کر چکا ہوں ایک طرح کی ذہنی تجرید یا منطقی ہیچ ہے۔ دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں آج غیر معمولی شابہتیں دیکھ کر دانایانِ مغرب کو خیال ہوا کہ وہ ان کا مشترک ماخذ قرار دیں۔ چنانچہ مغربی ہندی کے نام سے ایک زبان فرض کر کے

---

[1] اُردو اوریجن اینڈ ہندی صفحہ ۱۷۶

[2] اُردو زبان کا ارتقا باب سوم

انہوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ زبان گیارہویں صدی عیسوی میں ہریانی، برج، کھڑی، قنوجی، بندیلی کے وسیع و عریض علاقے میں بولی جاتی تھی۔ یہ بولیاں اس زبان کی کوکھ سے پیدا ہوئیں۔ ڈاکٹر گریرسن ہندوستانی کو مغربی ہندی کی نمائندہ زبان قرار دیکر لکھتے ہیں، "اس میں فعل کی صرف ایک گردان (مضارع) اور اسم کی صرف ایک اعرابی حالت (غیر فاعلی) ملتی ہے۔"[1]

اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے۔ اس لئے مغربی ہندی کو درمیان سے نکال کر یہ کہنا کہ اردو اپ بھرنش سے ارتقا پاکر وجود میں آئی زیادہ صحیح ہے۔ لیکن اپ بھرنش کسی ایک بولی کا نام نہیں۔ پراکرت دور کے بعد کی سبھی بولیاں جو بدل بدلا کر کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ اور درمیانی عہد کی پراکرتوں سے مختلف اور نئی زبانیں بنیں اپ بھرنش یا اپ بھرشٹا یعنی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ کہلائیں۔ مشہور قواعد نویس مارکنڈے نے اپنی "پراکرت سرودسو" میں کسی نامعلوم مصنف کے حوالے سے ستائیس اپ بھرنش شمار کرائی ہیں۔ لیکن وہ لکھتا ہے اصل اپ بھرنش صرف تین ہیں۔ ناگر، اپ ناگر اور وراچڈ۔ وراچڈ سندھ میں بولی جاتی تھی۔ ناگر کے بارے میں گریرسن کا خیال ہے کہ وہ شورسینی یا مغربی اپ بھرنش ہے۔ یہ گجرات کی زبان تھی۔ ہیم چندر گجرات کا رہنے والا تھا۔ اس نے مغربی اپ بھرنش کو مستند قرار دیکر اس کے اصول و قواعد اپنی کتاب میں بیان کئے۔ اپ ناگر کے بارے میں گریرسن کہتے ہیں کہ یہ غالباً گجرات اور سندھ کے درمیانی علاقے یعنی مغربی راجپوتانے اور جنوبی پنجاب میں بولی جاتی تھی۔[2]

اگر درحقیقت مغربی اپ بھرنش گجرات کی زبان ہے تو وہ اردو کا ماخذ نہیں ہو سکتی۔ اردو کھڑی سے ترقی پاکر بنی جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ دہلی اور میرٹھ کی زبان کسی ایسی زبان سے کیوں کر ماخوذ ہو سکتی ہے

۱۔ ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۲
۲۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۳ء صفحہ ۸۸۲، ۸۸۱

جو کبھی وہاں نہ تھی، اس کے حلقہ اثر سے میلوں دور گجرات میں بولی جاتی تھی، اور راجستھانی بولیوں کے وسیع و عریض علاقے نے بیچ میں حائل ہو کر ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔
اس کے علاوہ اردو کی لسانی خصوصیات کا مغربی اپ بھرنش سے مقابلہ کریں تو دونوں میں شدید اختلاف نظر آتا ہے اور ایک دو اصول کے سوا کوئی مشابہت نہیں ملتی۔ ذیل میں مختصر طور سے اردو اور مغربی اپ بھرنش کی لسانی خصوصیات کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱ — اردو کے عام طبعی میلان کے خلاف اپ بھرنش کا رجحان اسما و صفات میں مخلوط حروف صحیح کی جانب ہے۔ جیسے ڈھولّا (دولہا) بھلّا (بھلا) بھگّا (بھاگا) دونّی (دونوں) بجھّہ (بجھہ) مجھّہ (مجھ) پتّ (پوت) بپّ (باپ) اپّا (اپنا)

۲ — مغربی اپ بھرنش کے اسما سندھی کی طرح عام طور سے ـُ پر ختم ہوتے ہیں جیسے کنتُ (کانت)، ابنتُ (آتا)، جیوُ (جیو)، کاسُ (کس)، دھنُ (دھن، پیمُ (پیم = دوبارہ) اٹھُ (اٹھ = پیارا)، گنُ (گن)۔

۳ — اپ بھرنش دو حرکات کا اجتماع گوارا کر لیتی ہے لیکن اردو ان میں ادغام کر دیتی ہے جیسے ھُوُا (ہوا)، مایاَ (ماریا = مارا)، جیُ (جے = جو)، جیوُ (جیو) گنیُ (گنے) کئیُ (کے)۔

۴ — اردو کے مزاج کے خلاف اپ بھرنش اسمائے کے آخر کی حرکت برقرار رکھتی ہے۔ جیسے بہنِ (بہن)، بپّ (باپ)

۵ — قدیم پراکرت (سنسکرت) 'ت' کو اپ بھرنش نے شورسینی پراکرت کی طرح 'د' سے بدل دیا۔ جیسے کیلد (کریڈت = کھیلتا ہے) یا مہاراشٹری پراکرت کی طرح حذف کر دیا۔ جیسے جیو (سنسکرت جیوتم)، دَیَن (سنسکرت دَیتین)۔

۶ — اردو میں فاعل آلی حالت کا اظہار 'نے' سے ہوتا ہے اپ بھرنش میں 'یں' یا 'ین' سے جیسے دیریں یا دیریں (دیہ نے) اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو کر

'نے'' 'ہیں' سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔

۷ — اردو جمع متکلم کا صیغہ 'چلیں' اپ بھرنش 'چلہئوں' سے نہیں نکالا جا سکتا۔

۸ — فعل حال کا لاحقہ اردو میں 'ت' ہے اور اپ بھرنش میں 'نت'۔ یہ 'نت' مغربی پنجابی میں بھی تھا۔ الف پر ختم ہونے والے مادوں کے 'ا' کا حالیہ ناتمام میں 'ے' سے تبادلہ (ا بنت = آتا)، اپ بھرنش کا رشتہ مغربی پنجابی سے اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے جہاں 'ا' 'ے' سے بدل گیا ہے۔ جیسے کھیندا (کھاتا) پیندا (پاتا)[1]

۹ — اردو 'مارا' کسی ایسی زبان سے لیا گیا ہے جو سنسکرت حالیہ تمام کے اسما کا 'ت' گرا کر جین پراکرت کی طرح[2] 'ت' کو 'ی' بنا لیتی تھی اور 'مارت' کو 'ماری' یا 'ماریا' اور چلت کو چلی یا چلیا کہتی تھی۔ یعنی 'ی' اس میں مادے کے آخری حرف کے ساتھ مخلوط ہوا کرتی تھی جو بعد میں حذف ہو گئی، یا مہاراشٹری کی طرح 'ت' اس میں گر جاتی تھی۔ اب بھرنش مارا اردو میں 'ماریا' ہوگا یا ماری (جیسے وارا سے واری) 'مارا' نہیں ہو سکتا۔ اردو میں آخر سے الف گر جاتا ہے۔ درمیان کی 'ی' (جو مخلوط یا مخفی نہ ہو) نہیں گرتی۔

شورسینی پراکرت بھی اردو کے مارت سے منسب میں نہیں آتی۔ شورسینی کے جو اسما وصفات 'ے و' پر ختم ہوتے ہیں اردو میں ان کے آخر میں 'ا' ہے۔ شورسینی میں اسم حالیہ کی 'ت' 'د' سے بدل گئی اردو میں اپنی حالت پر قائم رہی۔ پراکرت 'ے' اور 'ے' (مرکب حرکات) اردو میں 'ے' اور 'و' ہیں۔ مخلوط حروف صحیح کی تخفیف کے بعد ماقبل حرکت کا اشباع شورسینی کے رجحان کے خلاف ہے۔ اردو علامت فاعل (آلہ) 'نے' پراکرت 'ے' سے زیادہ قدیم ہے۔ شورسینی قدیم سنسکرت 'ن' کو 'نڑ' کر لیتی ہے اردو میں 'نڑ' بھی 'ن' ہو جاتا ہے۔ شورسینی کا 'ی' کو 'ے' سے بدلنا اردو کے مزاج کے خلاف ہے

---

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۰

[2] ولسن فلولاجیکل لیکچرز صفحہ ۲۰

یہ چند مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اردو شورسینی پراکرت سے ماخوذ نہیں۔ یہ قریب قریب سبھی نے مانا ہے کہ جن پراکرتوں کا ذکر ہیم چندر، وررچی، مارکنڈے، ترو کرم، لکشمی دھر وغیرہ عالموں نے کیا ہے وہ سب ادبی بولیاں ہیں جو بول چال کی زبان سے بن سنور کر وجود میں آئیں۔ یہ تعداد میں چھ ہیں اس لئے شڈ بھاشا (شٹ بھاشا = چھ بولیاں) کہلاتی ہیں۔ وررچی نے مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، پیشاچی چار پراکرتوں کے قواعد لکھے۔ ہیم چندر نے چولکا پیشاچی اور اپ بھرنش دو کا اضافہ کر کے چھ پراکرتوں کے اصول و قواعد بیان کئے۔ ترو کرم اور لکشمی دھر ہیم چندر کی تقلید میں ان چھ پراکرتوں کے قاعدے اور ضابطے بیان کرتے ہیں۔ اپ بھرنش کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کسی مخصوص پراکرت کا نام نہیں۔ پراکرت میں جب تبدیلیاں ہوئیں اور وہ بگڑ بگڑا کر معیاری پراکرت سے مختلف زبان بنی تو اپ بھرنش کہلائی۔ پراکرتیں ہم عصر نہیں۔ پالی ان میں زیادہ قدیم ہے اسے اولیں پراکرت کہتے ہیں۔ نئی تحقیقات کے مطابق سنسکرت، پالی، شورسینی، مہاراشٹری، مغربی اپ بھرنش ایک زبان کے متعدد ادبی روپ ہیں۔ یہ زبان مدھیہ دیش (وسط ملک) یعنی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی جس سے نکھر کر یہ زبانیں بنیں۔ بول چال کی زبان بدلتی رہی یہ زبانیں جو علم و ادب کے اظہار و بیان کا آلہ بن چکی تھیں، رکی رہیں قواعد و اصول کی پابندیوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے یہ وہیں رہیں جہاں تھیں۔ بول چال کی زبان ترقی کر کے بڑھ گئی یہ زبانیں بول چال کی زبان کی چھوڑی ہوئی منزلوں کی یاد دلاتی ہیں یاد دلانے سے میرا مطلب ہے کہ یہ زبانیں بول چال کی زبان کے گزرے ہوتے دوروں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ پنڈتوں نے بول چال کی زبان میں تصرفات کرنے کے بعد انہیں ڈھالا۔ بول چال کی زبان کا اصلی روپ اس زمانے میں ان سے مختلف تھا جو ان زبانوں کا ہے یہ زبانیں اس کا اصلی روپ دکھاتی ہیں۔ ان کے خط و خال کا دھندلا سا عکس ان زبانوں کے آئینہ منقش و نگار میں دیکھا جا سکتا ہے مسیح علیہ السلام سے ۶۰۰ سال پہلے

پنجاب اور مدھیہ دیش (یوپی کے مغربی اضلاع) کی بولیوں پر سنسکرت کو ڈھالا گیا۔ اس کے بعد پالی کی تشکیل عمل میں آئی۔ میلاد مسیح کے بعد شورسینی اپ بھرنش وضع ہوئی۔ چوتھی صدی عیسوی میں مہاراشٹری کا خمیر تیار ہوا۔ شورسینی اپ بھرنش اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے جس سے اردو یا ہندوستانی نے جنم لیا[1]۔

ہر چند یہ زبانیں ارتقا کے ایک سلسلے میں واقع ہیں اور ایک ہی بولی کے پانچ مختلف دوروں کو پیش کرتی ہیں لیکن ان کو ایک دوسرے سے ماخوذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پالی مثلاً سنسکرت سے ترقی پا کر بنی۔ یا شورسینی پالی کا بدلا ہوا روپ ہے؟ یا مہاراشٹری نے شورسینی سے ارتقا پایا؟ یا اپ بھرنش نے مہاراشٹری سے جنم لیا۔ ایک تیسری زبان سے ان زبانوں کو وضع کیا گیا۔ اگر یہ تیسری زبان ہمارے سامنے ہوتی تو ہم اس کے ارتقائی دوروں کی تعیین کرتے۔ یہ زبانیں اس زبان کے ادبی روپ کو پیش کرتی ہیں جو ان کے اصلی بول چال کے روپ سے مختلف ہے۔

اردو یا ہندوستانی اپ بھرنش کے اس روپ سے ماخوذ ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں مدھیہ دیش میں رائج تھا۔ مغربی اپ بھرنش اس کی ادبی شکل ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہ بول چال کی اپ بھرنش سے مختلف ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی راہ ہے کہ ہم گیارہویں صدی کی بول چال کی اپ بھرنش تک جو ہندوستانی کی ماں ہے راہ پا سکیں؟ بول چال کی زبان کے نمونے عام طور سے محفوظ نہیں رہتے۔ ہر زمانے میں لوگ ادبی زبان کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس میں خط و کتابت کرتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، شعر کہتے ہیں۔ خطوط محفوظ رہتے ہیں۔ کتابیں دستبرد روزگار سے بچ جاتی ہیں۔ اشعار لوح قلب پر منقوش رہ جاتے ہیں۔ بات چیت فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں گزرے ہوئے لوگوں کی آوازیں غیر محدود فضا میں بھری ہوئی

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۶۳

ہیں۔ اگر سائنس اُن آوازوں کو قید کر سکی تو ہماری رسائی بول چال کی زبان تک ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا ان آوازوں تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے بزرگوں کے کچھ مقولے تاریخی کتابوں میں منقول ہیں۔ ان پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مقولے مدتوں زبانوں پر نقل ہوتے رہے ہے حسب ضرورت نقل کرنے والوں نے بول چال کے مطابق ان میں تصرفات کئے، ان کے کسی لفظ کو رائج الوقت لفظ سے بدل دیا، وہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ ان کی لسانی حیثیت وہ نہ رہی جو اس تصرف سے پہلے تھی۔

یہ بول چال کی اپ بھرنش دہلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی۔ چٹرجی اور گریرسن اسے مغربی اپ بھرنش کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ اپ بھرنش وہ نہیں جس کے قواعد ہیم چندر نے اپنی کتاب میں بیان کئے۔ مغربی اپ بھرنش کہنے سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ ہیم چندر کی اپ بھرنش ہے۔ اگر یہ اشتباہ نہ ہو تو دہلی اور میرٹھ کی اس قدیم زبان کو اپ بھرنش کے نام سے یاد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس زبان میں پورے پورے نمونے دستیاب نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ شورسینی اپ بھرنش کے اصول و قواعد کی وضاحت کرتے ہوئے ہیم چندر نے متعدد دوہے اپنی گرامر میں نقل کئے ہیں۔ ان میں بول چال کی اپ بھرنش کے بہت سے صیغے، شکلیں اور نحوی استعمالات بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں جب بول چال کی زبانیں کروٹ بدل رہی تھیں اور قانونِ ارتقا کے اثر سے نت نئے روپ اختیار کر رہی تھیں زبان کو خالص اور باہر کے اثرات سے پاک نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ زبانوں کے لئے تغیر کا دور تھا۔ تغیر کے دور میں زبانوں کا اختلاط معمولی بات ہے۔ ہیم چندر کے پیش کردہ دوہوں میں زبانوں کا یہ اختلاط صاف نظر آتا ہے۔ ان میں آس پاس کی بولیاں گلے ملتی اور آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ داسو کی بابت گریرسن اور چٹرجی کے حوالے سے میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ اس کی زبان ایک طرح کا ملغوبہ ہے جس میں پنجابی، راجستھانی سے اور قدیم ہندی مغربی اپ بھرنش سے دست و گریباں

ہوئی ہے اس اختلاط و آمیزش کے اسباب جو بھی ہوں مجھے ان سے بحث نہیں میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مغربی اپ بھرنش کے جو روپ ہے مثال کے طور پر ہیم چندر نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں اگر ان کا لسانی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ساتھ کی زبان پر بھی نظر رہے تو اردو کی لسانی خصوصیات اور اس کے صرفی نحوی سرمائے کا سراغ آسانی کے ساتھ لگ سکتا ہے اور اردو کے قدیم رنگ کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ ہیم چندر کے دوہے اور راسو کی زبان قدیم اردو (قدیم اردو اپ بھرنش) نہیں۔ اس میں قدیم اردو زبان کے مختلف معمولوں کی ملاوٹ بالکل اسی قسم کی ہے جیسے بالو میں سونے کے ذرے ملے ہوتے ہیں۔ ذیل میں ان زبانوں کی چھان پھٹک کر کے ان میں سے قدیم اردو روپ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سب سے پہلے مذکر اسماء کے اختتامیے 'ا' کو لیجئے۔ یہ اردو کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہیم چندر کے یہاں اس اختتامیے کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، اوپر جو مثال درج ہوئی ہے اس میں ڈھولا سانولا۔ دیہا۔ وارآ۔ وغیرہ اسماء و صفات الف پر ختم ہوئے ہیں۔ مغربی اپ بھرنش کے عام رجحان کے مطابق ان کے آخر میں 'ـُـ' (ضمہ) ہونا چاہیئے تھا۔ شیام سندر داس اسے پیے شاچی اپ بھرنش کا روپ بتلاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ دہلی اور میرٹھ کی اپ بھرنش کا روپ ہے۔ فعل حال اور حالیہ ناتمام کے لاحقہ 'تا' کو اس کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے، جو سنسکرت کے حالیہ ناتمام کے اختتامیے 'ـُـت' سے ماخوذ ہے اردو نے اس کے آخر میں 'ا' بڑھا کر فعل حال بنایا اور 'ہے' فعل معاون کے سہارے اسے گردانا کرتا ہے۔ کرتا ہوں۔ وغیرہ راسو میں فعل حال 'کرت ہے' 'کرت ہوں' کی شکل میں ہے۔

سُنو مَہوُں سَبَےٖ سُنَت ہوں مات۔

(ماتا! وہ سب میں سنتا ہوں)

میں اوپر عرض کر آیا ہوں کہ حالیہ ناتمام پر 'ہے' بڑھا کر فعل حال بنانا اردو کی خصوصیت ہے۔ برج میں کہوے۔ کروں وغیرہ افعال پر 'ہے' داخل کر کے فعل حال وضع ہوا تھا۔ راسو میں 'کرت ہوں' کے پہلو میں 'کروں' بھی ملتا ہے۔

ہوں جانی گیان ادھ کہوں توہی

(میں دانائے حکمت و عرفاں ہوں یہ تجھ سے کہتا ہوں)

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ برج نے بارہویں صدی کے قریب اردو فعل حال کے صیغے لیے۔ اردو میں اس کے مزاج کے مطابق یہ صیغے 'الف' پر ختم ہوتے تھے۔ برج نے 'گراکر' 'کرتا' کو کرت (ضمہ ت کے ساتھ) بنایا۔ مولانا شیرانی نے شیخ فرید الدین گنج شکر المتوفی ۶۶۵ھ کا مندرجہ ذیل مقولہ سید محمد بن سید مبارک کرمانی کی تصنیف سیر الاولیا سے نقل کیا ہے[1]۔

"مادر مومناں! پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"

اس میں ہوتا ہے فعل حال الف پر ختم ہوتا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا ایک مقولہ ان کے مرید عبداللہ بن رحمان چشتی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

بھوکیں موسے سوں خدا کی اپڑتیا ہے

اس کے ساتھ حالیہ تمام اور ماضی مطلق کے صیغوں اور ان کے آخری 'ا' پر بھی بحث کرتے چلیں۔ اردو فعل حال سنسکرت حالیہ ناتمام سے ماخوذ تھا۔ ماضی مطلق سنسکرت حالیہ تمام سے لی گئی ہے۔ راسو میں دکنی اردو کی طرح ماضی کے صیغوں میں آخری حرف سے پہلے ایک 'ی' بھی ہے۔ اس کے دو صیغے ہیں۔

	(راسو)		(اردو)
مذکر۔	چلیو۔ چلے	=	چلا۔ چلے

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰۰

مؤنث۔ چلی چلیں — چلی چلیں

وہی غلو طبار ہویں صدی کی اردو میں بھی تھی جو بعد میں تخفیف کی نذر ہو گئی - نی کا اختلاط اردو کی طبعِ نازک پر گراں تھا۔ 'کیوں' 'کیا' دو چار کلموں کے علاوہ اردو میں یہ اختلاط نہیں دیکھا گیا۔ فعل حال کے لاحقہ 'تا' کی طرح قدیم اردو میں ماضی کے صیغے 'ا' پر ختم ہوتے تھے۔ اس کے دو قرینے ہیں۔ پہلا یہ کہ 'کرنا' کی ماضی 'کیا' راسو میں جان بیمز کو ملی ہے[1]۔ دوسرے مولانا شیرانی تاریخ فیروز شاہی سے فیروز شاہ تغلق (۸۸ — ۱۳۵۱ء) کا یہ ہندی مقولہ نقل کرتے ہیں[2]۔

"برکت۔ شیخ تھیا (تھا)، اک موا (مرا)، ایک نہا (نسا = بھاگا)"

اس میں تھیا۔ موا۔ نہا ماضی کے صیغے 'ا' پر ختم ہوئے ہیں۔

ہیم چندر کا مندرجہ ذیل دوہا

بھلا ہوا جُ مارا بہن مہارا کنتُ

اوپر کہیں نقل ہو چکا ہے۔ اس میں ہوا۔ مارا کے آخر میں 'ا' ہے۔ یہ دوہا گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے کا ہے۔ مندرجہ ذیل مصرعہ بابر کی طرف منسوب ہے۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی

اس میں بھی 'ہوا' الف کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر ہیلی کو یہ مصرعہ بابر کے ترکی دیوان کے مخطوطہ ۱۵۲۹ء میں جس کا ایک نسخہ کتب خانہ رامپور میں ہے اسی طرح لکھا ہوا ملا[3]۔ سکندر شاہ بادشاہِ گجرات کا یہ مقولہ سولھویں صدی کے شروع کا ہے۔

"پیر مُوا مُرید جوگی ہوا"

شاہ وجیہ الدین گجراتی کے بھتیجے شاہ ہاشم علوی کے کچھ فقرے اور اشعار

۱۔ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۲ء صفحہ ۱۰۵

۲۔ پنجاب میں اردو (مقدمہ) صفحہ ۰

۳۔ بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد ۶ صفحہ ۲۰۵

شمس الدین قادری نے [1] "مقصود العاشقین" سے انتخاب کر کے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر بیلی نے ان کا زمانہ سنہ ۱۴۹۰ء بتایا ہے۔

پہلا مقولہ ہے :-

"باپ کے اپنا دیسے سو لوت، باپ نہیں دیوے سو سپوت، باپ کا دیا چھینے سو کپوت۔"

اس میں "دیا" حالیہ تمام "ا" پر ختم ہوا ہے۔ دوسرے مقولے [2] میں جو حسب ذیل ہے جو مد ستے شہ سے میں دو بہ رہا ہے تو شیو الکاسے تو کیا لفا (نفع)؟ تو وہ سب رہا "کا "رہا" حالیہ ہے اور "ا" پر ختم ہوا ہے۔

امیر خسرو (۱۳۲۵ء — ۱۲۵۰) سے یہ دو شعر عام تذکروں میں منقول ہیں۔

زلف کر لپیرسے چوں ماہ پارا   کیا کیا گھڑے سنوارے پکارا

اقتد دل من گرفت و شکست   پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

ان میں پکارا، گھڑا، سنوارا، الف پر ختم ہوئے ہیں۔

اردو کی ایک خصوصیت مخلوط حروف کی تخفیف و تسہیل بتائی گئی تھی۔ اس کے آثار راسو کی زبان میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیرالال پراکرت اپ بھرنش کے حوالے سے لکھتے ہیں پراکرت کے آخری دور میں مخلوط حروف میں سے ایک گرا کر اس سے پہلے حرف کی حرکت کھینچ دی گئی۔ ہیرالال پراکرت کے اس آخری دور کی تعیین نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ راسو کی تصنیف سے پہلے دسویں صدی کے آخر یا گیارہویں صدی کے شروع میں تسہیلی رجحان دہلی اور میرٹھ کی زبان میں رہا ہوا ہے۔ رجحان جیسا کہ میں اپنے ایک مقالے "اردو زبان کا ایک صوتی رجحان" (مطبوعہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۴ء) میں تفصیل کے ساتھ لکھ

---

[1] اردوئے قدیم طبع اول صفحہ ۲۵

[2] یہ شاہ ہاشم کے مرید شاہ نظام الدین کا دوہا ہے۔

چکا ہوں۔ ویدک عہد کی بعض بولیوں میں بھی تھا۔ پراکرتیں اس کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ماگدھی پراکرت کے واحد اضافت 'آہ' کی بابت کہتے ہیں کہ یہ پراکرت 'سس' سے (بحذف 'س' اول وتبدیل 'س' ثانی بہ 'ہ' وتطویل حرکت ماقبل) بنا ہے۔ قدیم اردو اور راجستھانی میں یہ رجحان شائع و ذائع تھا۔ قدیم راجستھانی کے نمونے ڈاکٹر ٹیسی ٹری نے پیش کئے ہیں[1]۔ قدیم اردو کے منتشر اور پراگندہ نمونے راسو میں دیکھئے۔

جو (سنسکرت یہ) موصولی کلمہ ہے جس کا مونث ج (بکسرۂ ج) ہے۔ پراکرت میں اس پر 'سس' (احتمالاً اضافت) اضافہ ہوا تو مذکر کے لئے 'جس' (بفتح اول وتشدید ثانی) ہوا۔ اور مونث کے لئے 'جس' (بکسرہ اول) تخفیف وتسہیل کے بعد جس کا 'جاس' بنا اور جس کا جیس۔ اردو جس جیس کی تخفیف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدیم اردو میں 'جس' کی صرف تخفیف ہوئی یعنی اس کا 'س' حذف ہوا اس کی تسہیل یعنی 'س' کے عوض میں ماقبل حرکت کی تطویل نہیں ہوئی۔ یہ کلمہ احادی المقطع یعنی یک جزا تھا۔ اردو میں عام طور سے یک جُزے کلمات کی تسہیل نہیں ہوتی۔ راسو میں البتہ 'جاس' اور 'تاس' مسہل استعمال ہوئے ہیں۔ یہ کلمے اصلاً اضافی حالت میں تھے۔ بعد میں امتداد زمانہ کے زیر اثر اردو وغیرہ زبانوں میں غیر فاعلی حالت کے لئے استعمال ہوئے۔ اضافی حالت کی دو مثالیں راسو سے لے کر درج کی جا رہی ہیں۔

۱۔ تاس راج سمیپم (اس راجا کے قریب)

۲۔ دلیو گری جس جیس (جس کا جس دیوگری سا ہے)

ان سے بیک وقت اُردو کی دو اہم خصوصیتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک اس کا تخفیفی رجحان۔ دوسرے ضمائر، موصولات، حروف استفہام کی غیر فاعلی حالت میں 'س' کا وجود۔ یہ خصوصیتیں بارھویں صدی عیسوی کی اردو میں بھی تھیں۔ اس کی تائید ذیل کے مقولوں سے ہوتی ہے جو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (۹۰۰–۱۵۰۵) کی طرف منسوب ہیں

---

[1] انڈین انٹی کوئری ۱۹۱۴–۱۹۱۶ء –

"اس میں ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں دل خدا سوں مشغول ہووے"[1]

دوسرا مقولہ ہے:-

"عارف اسے کہویں جو خدا سوں بھر یا ہووے"[2]

ان میں 'اس' اور 'اسے' 'اس' کی غیر فاعلی حالت کی علامت ہے۔

شیخ بہاء الدین باجن (متوفی ۹۱۲ ھ) کے دوہروں میں بھی اُردو کا یہ 'س' موجود ہے:

باجن وہ کسی سرکھیا نہیں اور اُس سرکھیا نہیں کوی

جیسا کوی من منۂ چنت سے ویسا بھی نہ ہوی

(سرکھیا۔ مثل۔ من منۂ۔ من میں۔ چنت۔ سوچے یا چنتا کرے)

باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے اُس سے ورجن ہتھر ہتھر کانپے[3]

محمد قلی قطب شاہ (۱۶۱۱ -- ۱۵۸۰) کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے کہیں اس سے مل بیسیا جائے نا

'میں' اور 'پر' اردو کے ظرفی لاحقے ہیں جو اردو کی خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ 'داسو' میں 'ہ' اور 'پے' عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔ 'پے' اردو میں 'پہ' ہے 'میں' کی جگہ چند بردائی نے مدھ۔ مدھیئے۔ مجھ۔ مانجھ۔ مہی۔ ماہم وغیرہ صیغے استعمال کئے ہیں جن میں سے 'مہی' اور 'ماہم' کے بارے میں ہیورنلے وغیرہ علمائے لسانیات کا خیال ہے کہ یہ 'میں' کے قدیم ترین روپ ہیں۔ 'داسو' میں بھی ملا ہے۔ جیسے۔

ایک ماس میں نگر بسایو (ایک ماہ میں شہر بسایا)

یہ مصرعہ حال کی زبان سے بہت قریب ہے۔ شاید اہل علم اس کی قدامت سے انکار کریں لیکن حافظ محمود شیرانی اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مصرعہ

---

[1] اردوئے قدیم، طبع اول، صفحہ ۲۴

[2] " " "

[3] حافظ محمود شیرانی: پنجاب میں اردو، صفحہ ۴۰۸۔

چند برحائی کا ہے۔ ذیل کے شعر میں بھی میں نے ہے۔ لیکن ہیمزا سے معنوی سمجھتے ہیں۔ احمد کہتے ہیں ہر چند اس کا اسلوب چند کا ہے لیکن یہ شعر الحاقی معلوم ہوتا ہے۔

(وہ ناری نیچے کرے پڑے ترک میں واس)

(وہ عورت بے شبہ جہنم کے ورک استق میں اپنا ٹھکانا کرے گی)

واحد متکلم کے لئے 'میں' خاص اردو ہے۔ برج بھاشا اور پنجابی میں 'ہوں' اس کا جانشین تھا۔ راسو میں 'ہوں' کے ساتھ میں بھی دیکھا گیا ہے۔

میں سُنیا ساہی پت اِنشی کین   تج بھوگ جوگ میں تپ لین

(میں نے سنا کہ شاہ نے اس کو اندھا کر دیا۔ کھانا پینا چھوڑ کر میں نے تپسیا کی) 'میں' کی غیر فاعلی حالت 'مجھ' ہے اور تم کی 'تجھ'۔ 'میں' اور 'تم' کے ساتھ ان کی غیر فاعلی حالتیں 'مجھ' اور 'تجھ' بھی راسو میں ملی ہیں۔ 'ہم' اور 'تم' کی مثالیں۔

ہم تم کبھو نہ ور وو   (ہم تم کبھی مخالف نہیں ہوئے)

ہم تم کام اہ شیت آج   (ہم تم آج اس کھیت میں کام کریں گے)

'مجھ' اور 'تجھ' کی مثالیں۔

اہ دھرتی مجھ پت پرپت   (یہ زمین میرے باپ دادا کی)

شروں سناؤں تجھ   (تجھے یہ قصہ سناؤں)

میرے۔ میری۔ ہمارے۔ ہماری متکلم ضمیروں کی اضافی حالتیں ذیل کے مصرعوں میں ملاحظہ فرمائیں۔ 'میرے' کی مثال:۔

ست بھرات میرے ہتے   (سات بھائی میرے مارے گئے)

'میری' کی مثال:۔

اہ میری عرض داست   (یہ میری عرض داشت ہے)

ہماری کی مثال:۔

آلہا سنو ہماری نیہ (آلہا ہماری بات سنو)

وہ 'نہ سہی اس کی جمع 'وے' ذیل کے مصرعے میں ہے۔

وے حادسے ترو ار (وے تلوار چلاتے ہیں)

جیسو (جیسا)، کیسو (کیسا)، کتنو (کتنا)، وغیرہ کلمات راسو میں برج کے لہجے میں استعمال ہوئے ہیں۔

اردو کی طرح چند نے حاصل مصدر مادے پر 'ن' بڑھا کر بنایا ہے "بھیکھو چلن کو ساج" (چلنے کا ساز و سامان کیا)

پرشاتن تن بندھن بجاپہ (ان کے پرشاتن کو رد کرنے کی فکر کرکے)، 'نے' 'یا' 'نیں' کا استعمال بھی ہوا ہے۔

پرتھی راج سنی کنور نین۔ آپ بلائے حت۔

(کنور پرتھی راج نے سن کر آپ بڑے چاؤ سے مہمان بلائے)

اودھی اور پنجابی لہجے کے مطابق چند بردائی نے 'و' کو 'ہ' اور 'یہ' کو 'ہ' لکھا ہے لیکن ذیل کے مصرعے میں 'یہ' اردو کی غمازی کر رہا ہے۔

یہ پہ مال لکھیو۔ کر دیو (یہ مال نے یہ لکھا ہے) کہہ کر اس کے ہاتھ میں دے دیا)

ان۔ ان۔ کوں (کو)۔ کے۔ کی۔ (اضافت کے لئے) کا استعمال بھی عام طور سے راسو میں دیکھا گیا ہے[۱]۔ علامت مستقبل 'گا' کا سراغ راسو میں نہ مل سکا لیکن شیخ شرف الدین بوعلی قلندر (متوفی ۷۲۴ھ) کا حسب ذیل دوہرہ مولانا شیرانی مرحوم نے نقل کیا ہے۔ اس میں 'گا' موجود ہے۔

---

[۱] یہ مثالیں جان بیمز کے مقالے "چند بردائی کی گرامر" سے ماخوذ ہیں۔ جو جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی اشاعت ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔

سجن سکار سے جائیں گے نین مریں گے روئے — بدھنا ایسی رین کر کبھو رکدھی نا ہو سے

ذیل کا شعر کبیر کا ہے :-

ماٹی کہے کمہار کوں تو کہاں روندے موہیں

اک دن ایسا ہوے گا میں روندوں گی توہیں

شیخ باجن کے یہاں 'گی' 'گا' کا سراغ ملا ہے۔

باجن بجکاری بکھان کرے گا — بھیک کے کارن کچھ کچھ کہے گا

اور یہ جو صیغے اور ان کی مختلف شکلیں راسو، اپ بھرنش، اور صوفیہ کرام کے مقولوں سے اخذ کر کے درج ہوئیں نہ اردو کی اہم لسانی خصوصیتیں ہیں جن کا ذکر اس مقالے کی تمہیدی حصے میں تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ یہ صیغے گیارہویں صدی کے قریب دہلی اور میرٹھ کی زبان میں رائج تھے۔ آج کی اردو میں بھی جوں کے توں یا کسی قدر تصرف کے ساتھ ان کا عام رواج ہے یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اردو نے جس قدیم اپ بھرنش سے ارتقا پایا، گیارہویں صدی میں اس کی شکل موجودہ اردو سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ اس زمانے میں بھی برج، ہریانی، مشرقی پنجابی وغیرہ پاس پڑوس کی زبانوں سے مختلف اور آزاد زبان تھی۔ اس نے شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے جس کے قواعد ہیم چندر اور مارکنڈے بیان کرتے ہیں، ارتقا نہیں پایا۔ وہ دہلی اور میرٹھ میں بولی جانے والی اپ بھرنش سے ترقی پا کر بنی۔ ہر چند اس اپ بھرنش کے خدوخال واضح نہیں لیکن اردو کی موجودہ خصوصیات کو دیکھ کر اس کے نقش و نگار کی تعین نہ سہی اس کا دھندلا سا خاکہ، جو کسی قدر غبار آلود بھی ہے مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں ضرور آجاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شورسینی اور ماگدھی اپ بھرنش کی طرح یہ آزاد اور مستقل اپ بھرنش ہے لیکن ڈاکٹر گریرسن کی ہم نوائی میں کہا جا سکتا ہے "ہندی تحریروں کی اپ بھرنش ہوتے ہوئے بھی بعض اہم لحاظ میں یہ ان سے مختلف ہے"[1]

---

[1] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۶ حاشیہ صفحہ ۲۵۰

مولانا شیرانی نے صوفیہ کرام کے چند مقولے درج کرنے کے بعد لکھا تھا[1]

"ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) ہی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے یعنی اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو اس کو ایک طرف برج سے اور دوسری طرف پنجابی سے ممیز کرتی ہیں" ہوتا ہے نہ پنجابی ہے نہ برجی اس سے اس امر کا پتا چلتا ہے کہ اہل پنجاب ان ایام میں اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔"

مسٹر اے ہرنیکوف کے حسب ذیل بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"کھڑی بولی ایک آزاد زبان ہے مقامی بولیوں میں سے کسی ایک بولی کی اساس پر اس کی تعمیر ہوئی۔ لیکن یہ سوال کہ یہ مقامی بولی دہلی، آگرہ، میرٹھ کی زبان تھی، جیسا کہ ہندو علماء کا خیال ہے، یا پنجاب کی کوئی بولی جیسا کہ ڈاکٹر گریرسن فرماتے ہیں، موجودہ بحث کے حدود میں نہیں آتا۔"[2]

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰۱
[2] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۵ ص ۳۷۹

(۶)

اخذ و استفادہ

ڈاکٹر ہیورنلے کی کتاب "گوڈین زبانوں کی تقابلی گرامر" ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی اس کے مقدمے میں انہوں نے پاک و ہند کی جدید آریائی زبانوں کے رشتوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ہندوستان کی لسانیاتی تاریخ کے چار دور ہیں۔ دور اول میں ماگدھی پراکرت کا رواج تھا جو کسی نہ کسی شکل میں شمالی ہند کے مختلف حصوں میں بولی جاتی تھی۔ اس وقت تک آریا قبائل مشرق کی طرف نہیں گئے تھے۔ دوسرے دور میں ماگدھی کے پہلو بہ پہلو شورسینی ابھری اور دونوں ساتھ ساتھ بولی جانے لگیں تیسرے دور میں ان میں سے ہر ایک دو دو بولیوں میں بٹی۔ شورسینی نے مغرب اور شمال کی آریائی زبانوں کو جنم دیا اور ماگدھی نے مشرق اور جنوب کی بولیوں کو۔ چوتھے اور آخری دور میں جدید آریائی زبانیں نمودار ہوئیں۔ پہلے دور کی ابتدا مسیح علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً ایک صدی پہلے ہوئی۔ یہ وررچی کی پراکرت گرامر کی تصنیف کا زمانہ ہے۔ جدید آریائی زبانوں کا قدیم ادب تیسرے دور کی نشان دہی کرتا ہے اور ہند آریائی زبانوں کے تیسرے دور کا ارتقا کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس ادب میں ایک

طرف مغرب کی شورسینی بولیاں مغربی ہندی، پنجابی، گجراتی، راجستھانی گڈمڈ نظر آتی ہیں، دوسری طرف بنگالی اور بہاری ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں۔ مغرب کی آریائی زبان کے شاعر چند بردائی کے یہاں مغربی ہندی، پنجابی، گجراتی، راجستھانی زبانوں کے درمیان امتیاز نا ممکن ہے۔ مشرقی زبان کے شاعر ودیاپتی کے یہاں بنگالی اور بہاری کا ملاپ نظر آتا ہے۔ پندرہویں صدی کے بعد جدید آریائی زبانوں کے خط و خال اُبھر کر نمایاں ہوئے تو کبیر داس، تلسی داس، کوی کنکن، اپیندر بھنج، تکارام، نرسنگھ مہتا کے کلام میں آج کی آریائی زبانیں ممتاز نظر آتی ہیں۔[1]

مجھے فی الحال پہلے اور دوسرے دور سے بحث نہیں۔ تیسرے دور میں ڈاکٹر ہیرنلے کے خیال میں پنجابی، مغربی ہندی، گجراتی، راجستھانی کے درمیان امتیاز نہ تھا۔ ان ملحقہ کے علاقوں میں ایک زبان بولی جاتی تھی جو بعد میں چار حصوں میں تقسیم ہوئی۔ ڈاکٹر گریرسن ۱۹۰۱ء سے پہلے ہیرنلے کی رائے سے اس حد تک متفق تھے کہ مشرقی پنجابی، گجراتی، راجستھانی مغربی ہندی زبانوں کو ایک گروہ میں رکھ کر انہوں نے مغربی وسطی گروہ یا وسطی گروہ کا نام دیا۔[2] ۱۹۰۱ء کے بعد انہوں نے مغربی ہندی کو مدھیہ دیش کی زبان بتایا اور پنجابی، راجستھانی گجراتی کو ہندی، لہندا اور سندھی کے درمیان رکھ کر کہا کہ مدھیہ دیش کی زبان مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم زمانے میں یہ دوآبے میں بولی جاتی تھی جو آریائی تہذیب کا مرکز تھا۔ وسطی گروہ کی یہ تنہا نمائندہ زبان ہے۔ پنجابی، گجراتی اور راجستھانی ایک طرف ہندی دوسری طرف لہندا اور سندھی کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے بین بین حیثیت رکھتی ہیں۔ شمال مغرب کی طرف مغربی ہندی کے دھاوے کی نشان دہی پنجابی کرتی ہے اور جنوب مغرب کی طرف اس کے اقدام کی جھلک راجستھانی اور گجراتی زبانوں کے آئینۂ خط و خال میں نظر آتی ہے۔"

---

[1] مقدمہ صفحہ ۲۹ : ۳۰

[2] کشمیری زبان کے لاحقے "مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۵ صفحہ ۳۲۰۔"

شمال مغرب میں پنجابی اور جنوب مغرب میں راجستھانی (جس میں گجراتی بھی شامل ہے) ایک طرح سے مخلوط اور ملی جلی زبانیں ہیں جنہوں نے مغربی ہندی سے بیش از بیش استفادہ کیا۔ اور اس استفادے کی وجہ سے وہ اتنی بدل گئیں کہ ان کی اصلیت مشتبہ ہو گئی۔ گریرسن اور میورتلے کے نزدیک اصل و نسل کے لحاظ سے وہ بیرونی حلقے کی زبانیں ہیں۔ ان کا تعلق سندھی لہندا اور کشمیری سے ہے لیکن مغربی ہندی کے اثر میں آنے کے بعد مدھیہ دیش کی بولی سے یہ اتنی قریب ہو گئیں کہ اندرونی گروہ کی معلوم ہونے لگیں۔ مغربی ہندی نے مشرق کی طرف بڑھ کر مشرقی ہندی کو بھی متاثر کیا۔ یہ تاثر مغرب کی زبانوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی وجہ گریرسن یہ بتلاتے ہیں کہ کسی قدیم زمانہ میں غالباً کثرت آبادی کے باعث مدھیہ دیش کے باشندوں نے شمال کی طرف بڑھ کر پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور جزوی طور سے اپنی زبان ہندی وہاں کے باشندوں پر مسلط کر دی تھی۔ اس وقت پنجاب میں لہندا کا بول بالا تھا۔ موجودہ پنجابی مدھیہ دیش کی زبان کے تغلب اور تسلط کا نتیجہ ہے۔ وہ نصف ہندی ہے اور نصف لہندا۔ پنجاب کے تین حصے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں اردو (ہندوستانی) بولی جاتی ہے۔ وسطی پنجاب میں موجودہ پنجابی کا رواج ہے۔ مغرب میں لہندا کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ پنجاب کی اس لسانی تقسیم کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ پنجاب کا جو حصہ مدھیہ دیش سے ملحق ہے وہ مدھیہ دیش کی زبان مغربی ہندی سے بیش از بیش متاثر ہوا۔ مغرب کی جانب لہندا کے علاقے تک پہنچتے پہنچتے تاثر کا زور ختم ہو گیا۔ راجپوتانے کی بولیوں کی کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ مغربی ہندی راجپوتانے کو روندتی ہوئی گجرات تک پہنچ گئی۔ گجرات کی زبان اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں لیکن مدھیہ دیش سے قریب ہونے کی وجہ سے راجستھانی مغربی ہندی سے نسبتاً زیادہ مشابہ ہے۔ راجستھان کی طرف مغربی ہندی کے دھاوے کا گریرسن نے تاریخی ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ مدھیہ دیش کے باشندے راجستھان کی طرف ہجرت کر کے گئے۔

اور وہاں انہوں نے مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھی گریرسن کے بیان کردہ تاریخی حقائق میں یہاں دُھرانا نہیں چاہتا۔ جو چاہیں وہ ان کے مقالے "ہند آریائی بولیاں" (مطبوعہ بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد اول) ملاحظہ فرمائیں۔ پنجاب کی طرف   ہجرت کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں گریرسن کا قیاس ہے جو لسانی اور تہذیبی بنیادوں پر قائم ہے مولانا شیرانی کا فرمانا

"ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوتے رہے ہیں[1]۔"

درست ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا

"ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا[2]۔"

مجھے حقیقت سے بعید نظر آتا ہے۔ مولانا جن سیاسی واقعات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں وہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد کے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا پھیلاؤ "دوآب" یا مولانا کے لفظوں میں "میاندآب" سے شمال کی طرف رہا۔ دوآب آریائی تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا۔ یہاں کی تہذیب کے اثر سے گرد و پیش کی تہذیبیں اور یہاں کی زبان سے نواح کی زبانیں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ مہابھارت میں پنجاب اور وہاں کے دیر باشندوں کی بابت جو کچھ کہا گیا ہے وہ بے شبہ غلط ہے۔ مجھے مولانا شیرانی سے اتفاق ہے کہ یہ بیان دشمن کے قلم کا ٹپکایا ہوا زہر ہے لیکن حقیقت

---

[1] پنجاب میں اُردو، طبع دوم، صفحہ ۹۔
[2] پنجاب میں اُردو، طبع دوم، صفحہ ۹۔

ہے کہ آریا تہذیب کا خمیر میا نداب کی سرزمین سے اُٹھا۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب بہار سے لے کر متھرا تک کے علاقے میں وجود میں آئے ۔ رام اور کرشن کی تحریکیں اور ان کی لہریں ساحلِ گنگ وجمن سے اٹھ کر پنجاب تک پہنچیں۔ تہذیبی واقعات کا بہاؤ برابر جنوب سے شمال کی طرف رہا۔ زبان انسانی تہذیب و شائستگی کا سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ ہے۔ جو قومیں زیادہ مہذب، زیادہ شائستہ اور زیادہ قیمتی لسانی سرمایہ کی مالک ہوتی ہیں وہ دوسری اقوام کی تہذیب و زبان کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتیں۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اس لسانی تاثر کے کئی دور ہیں۔ پہلا زیادہ قدیم ہے اس کا آغاز ہیورنلے کے نظریے کے مطابق آریائی زبانوں کے تیسرے دور سے ہوا اس دور میں دو آبے کی زبان مغربی ہندی نے پنجابی پر اثر ڈالا۔ دوسرا دور مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد کا ہے اس کا ذکر مولانا شیرانی فرماتے ہیں۔ اس دور میں پنجابی نے کسی قدر اردو کو یا اردو کے دکنی روپ کو متاثر کیا۔ تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں نے دہلی میں نئی مرکزی حکومت قائم کی اور دکن، گجرات، بنگال وغیرہ صوبے فتح کر کے اپنی نئی مرکزی حکومت کی حدود کو وسیع کیا، اس کی بنیادوں کو استوار بنایا۔ اس دور میں دہلی کی زبان اردو مسلمانوں کے ہمرکاب رہی۔ وہ ان کے گھوڑوں کے سموں سے اٹھائی ہوئی گرد کے ساتھ ہر مقام پر پہنچی، وہاں کی زبانوں کو روندا، اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ مولانا ان تینوں دوروں میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سے ہندوستانی (اردو) اصل زبان کی نمائندہ ہے اور جیسا کہ گریرسن نے لکھا ہے، ہندوستانی کی گرامر مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے لیے معیار کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا۔ کہ لاسو کی زبان کو غلطی سے

لہ "معارف" اگست ۱۹۲۸ء، صفحہ ۱۱۵

لہ ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۲

قدیم ہندی سمجھ لیا گیا۔ اور چونکہ یہ برج سے زیادہ قریب تھی، اس لئے مغربی ہندی کی نمائندہ زبان برج بھاشا قرار پائی۔ میں اس پر تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ بیور ظلے کی رائے اوپر لکھی جا چکی ہے۔ راسو کی زبان اس عہد کی ہے جب ہندی پنجابی سے ممتاز نہ تھی اور پنجابی راجستھانی سے۔ ان کے امتیازی خدوخال اُبھر کر ہنوز نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ میرے خیال میں ہندوستانی نے جب مدھیہ دیش سے قدم باہر نکالا اور اس کا سابقہ ایک طرف لہندا سے پڑا، جو بقول گریرسن اس وقت پورے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی۔ دوسری طرف اس کی مڈبھیڑ راجستھانی سے ہوئی تو اس تصادم یا میل ملاپ سے ایک طرح کی ملی جلی اور مخلوط زبان وجود میں آئی۔ یہ راسو کی زبان ہے۔ چٹرجی راسو کی زبان کو شاید اس لئے خود ساختہ بتلاتے ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی میں جو راسو کی تالیف کا زمانہ ہے اس قسم کی مخلوط زبان کا وجود نہ تھا۔ کوئی ایسی زبان نہ تھی جو کہیں بولی جاتی ہو اس وقت ہندوستانی، راجستھانی، پنجابی، گجراتی زبانیں ابھر کر ایک دوسرے سے ممتاز اور مختلف ہستی کی مالک بن چکی تھیں۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں ہریانی، جو دراصل ہندوستانی کی شاخ ہے، ملی جلی زبان کی بڑی اچھی مثال ہے۔ ہریانی بارہویں صدی کے بعد ابھر کر سامنے آئی۔ اس لئے اس پر وہ دھندلکا نہیں جو راسو کی زبان پر چھایا ہوا ہے۔ ہریانی کا کچھ حصہ ہندی ہے اور کچھ پنجابی یا راجستھانی" وہ ایک طرح سے راسو کی قدیم مخلوط زبان کی تشکیل نو ہے۔

ہندوستانی (اردو) دوآب کی اہم نمائندہ زبان ہے اس کا ثبوت خود اس کی ساخت ہے۔ گریرسن نے مغربی ہندی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ مکمل طور سے تحلیلی زبان ہے فعل کی ایک گردان (مضارع) (۱) اسم کی ایک اعرابی حالت (غیر فاعلی) کو چھوڑ کر تقریباً تمام بحثوں اور اعرابی حالتوں کا اظہار اس میں حالیہ، معاون افعال، اور حروف مغیرہ کی مدد سے ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف اردو میں پائی جاتی ہے۔ اردو

میں قدیم افعال کا بقیہ صرف ایک فعل مضارع ہے، پنجابی، راجستھانی، گجراتی ہندی اور برج میں مضارع کے علاوہ مستقبل بھی ہے جو کہیں 'س' کے اضافے سے بنتا ہے (پنجابی راجستھانی وغیرہ میں) اور کہیں 'ہ' کے اضافے سے (برج) اردو ماضی حالیہ تمام سے بناتی ہے اور فعل حال حالیہ ناتمام سے۔ ان کا استعمال اردو میں تحلیلی انداز سے ہوتا ہے یعنی ان کے ساتھ فاعل کی ضمیریں متصل نہیں ہوتیں جیسے 'وہ گیا'، 'وہ جاتا ہے'، 'میں گیا'، 'میں جاتا ہوں'، 'ہم گئے'، 'ہم جاتے ہیں'۔ ان مثالوں میں 'گیا' 'جاتا' وغیرہ فعل کے ساتھ فاعل کی ضمیریں مل کر نہیں آئیں، ان سے الگ رہیں کشمیری، سندھی، مغربی پنجابی بیرونی گروہ کی زبانیں ہیں۔ ان میں افعال کے ساتھ فاعل کی ضمیریں ملی ہوتی ہیں۔ چند مثالیں وضاحت کے لئے کافی ہوں گی:۔

(سندھی)	(لہندا)	(اردو)
واحد متکلم - چلیوسے	چل اس، چل اسم	(میں) چلا
جمع متکلم - چل آسیں	چل اوسے	(ہم) چلے

'س'، 'م' واحد متکلم کی ضمیریں ہیں اور 'سیں' یا 'سے' جمع متکلم کی جو فعل کے ساتھ متصل ہیں۔

فعل حال کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

	(سندھی)	(لہندا)	(اردو)
متکلم (واحد)	چلندسے	چلندا	چلتا
متکلم (جمع)	چلنداسیں	چلندے	چلتے

سندھی میں بدستور یہاں بھی فاعل کی ضمیریں فعل سے متصل رہیں البتہ لہندا نے اردو کے اثر سے (بواسطہ پنجابی) ان ضمیروں کو تراش کر فعل سے الگ کر دیا۔

اردو میں صرف ایک تالیفی ظرفی حالت ہے جو کہیں کہیں ظروف میں مستعمل ہے

جیسے سویرے، اندھیرے، اجالے، دریا کنارے، وغیرہ کی نے؛ سندھی اور لہندا میں ابتدائی، ظرفی، آلی تین قدیم تالیفی حالتیں ہیں۔ اس کے علاوہ لہندا اور سندھی فعل مجہول 'ی' کے اضافے سے بناتی ہیں۔ اردو میں اس کے مزاج کے مطابق مجہول فعل ماضی 'جانا' اور اس کے صیغوں کی مدد سے بنتا ہے اس باب میں اردو تحلیلی ہے۔

اردو نے اپنی تحلیلی فطرت سے پنجابی کو متاثر کیا پنجابی میں تالیفی فعل مستقبل مستقل تھا جو مارواڑی، گجراتی اور برج کی طرح 'سی' لگا کر بنایا جاتا تھا۔ اردو کے اثر سے تالیفی مستقبل ترک کر کے پنجابی نے اردو کا تحلیلی انداز اختیار کیا اور 'گا' بڑھا کر مستقبل بنانے لگی۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں 'سی' کی تصریف سے جو مستقبل بنتا ہے اس کا تعلق زیادہ تر لہندا یا ملتانی سے ہے[۱] میں اوپر عرض کر آیا تھا۔ کہ جیسے جیسے مغرب کی طرف جائیں پنجابی پر اردو اثرات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اردو کے تحلیلی رجحان کے اثر سے 'سی' والا مستقبل کبھی پنجابی میں بھی تھا لیکن آج نہیں رہا ملتانی میں آج بھی ہے۔

دوآبے کی زبان کی دوسری بڑی خصوصیت جو اس کی مرکزیت ثابت کرتی ہے اس کا قدیم واضح اور صحیح تلفظ ہے اردو میں 'س' کا تلفظ ٹھیک اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کبھی اس علاقے کی قدیم زبان سنسکرت میں ہوا کرتا تھا۔ اردو عام طور سے 'س' کو 'س' رکھتی ہے 'ہ' سے نہیں بدلتی۔ عام طور سے اس لیے کہ اردو میں چند کلمے ایسے بھی ہیں جن میں 'س' صورت بدل کر 'ہ' ہو گیا ہے یہ تعداد میں بہت کم ہیں اور اس کے کئی قرینے ہیں کہ اردو نے ان کے 'س' کو 'ہ' سے نہیں بدلا۔ یہ کلمے کسی دوسری زبان سے اردو میں آئے اور جس وقت آئے ان کا 'س' روپ بدل چکا تھا، آج وہ اپنی بدلی ہوئی شکل میں سکۂ رائج الوقت بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً[۲] گیارہ سے لے کر اٹھارہ تک کے اعداد، ان کے آخر کی 'ہ' 'س' کا بدلا ہوا روپ ہے گیارہ = ایکادش = اکادس = اکادہ = اگارہ

۱؎ پنجاب میں اردو صفحہ ۱۰۸

۔ گیارہ ان چند کلمات کو چھوڑ کر اردو نے پراکرت کے 'س' کا تلفظ 'س' ہی کیا۔ نہ اسے پنجابی اور سندھی کی طرح 'ہ' سے بدلا اور نہ بنگالی کی طرح 'ش' سے۔ اردو کے اس تلفظ کا اثر مغرب میں پنجابی پر ہوا اور مشرق میں بہاری پر۔ پنجابی کے بہت سے کلمے ہیں جن کا 'س' اس کے مزاج کے مطابق 'ہ' ہو جانا چاہیے لیکن اردو کے اثر سے وہ 'ہ' نہیں ہوا۔ پنجابی میں 'تہاڈا' یا 'تواڈا' کی ایک شکل 'تساڈا' (س کے ساتھ) ہے۔ اس (اُہ)، اس (ایہ) کیسا (کیہا)، ان سب پر اردو کی چھاپ ہے۔ بہاری میں چند 'س' کو 'ش' لکھا جاتا ہے لیکن قدیم اردو کے اثر سے اس کا تلفظ 'س' ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر چٹرجی نے اسمائے اعداد کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تصریح کی ہے کہ گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد اپنی ساخت اور فطرت کے لحاظ سے اردو معلوم نہیں ہوتے۔ ان میں دوہری بے ضابطگی ہے۔ قدیم 'د' کا 'ڈ' ہوتے ہوئے 'ر' بن جانا مشرقی پراکرت کی خصوصیت ہے اور 'س' کا 'ہ' سے بدل جانا پنجابی وغیرہ شمال مغربی زبانوں کا خاصہ ہے[1]۔ ایسے الفاظ اردو میں اور بھی ہیں جن کا 'س' 'ہ' ہو گیا ہے لیکن یہ الفاظ اردو میں باہر سے درآمد ہوئے ہیں۔

اس سلسلے کی ایک اور خصوصیت 'ہ' اور ہائیہ حروف (تھ - دھ - چھ - بھ وغیرہ) کا تلفظ ہے۔ اردو کی خصوصیت ہے جس میں مشرقی ہندی اور بہاری اس کی شریک ہیں کہ وہ 'ہ' کا تلفظ واضح اور جلی انداز میں کرتی ہے اور قدیم ہائیہ حروف کو علی حالہٖ باقی رکھنے میں (چٹرجی کے الفاظ میں) قدامت پسند اور کہنہ خیال رسمی لکیر کی فقیر واقع ہوئی ہے۔ کلمہ کے آخر کی 'ہ' کا عام طور سے اظہار نہیں ہوتا۔ فارسی کی ہائے مختفی کی طرح وہ تلفظ میں دب جاتی ہے لیکن اردو 'ہ' کا اظہار کرتی ہے 'بارہ' اور 'تلوہ' کی 'ہ' اردو میں پوری پوری ادا ہوتی ہے اسی طرح گہا گہی، جھاڑ جھنکاڑ، سانجھ، بانجھ، باگھ، ڈھول

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۴۴ - ۴۵

پڑھ، وصو، ڈھو، بھائی، پھوپی، الجھاؤ وغیرہ کلمات کے ھائیہ حروف، اس سے قطع نظر کہ وہ شروع کلمے میں ہیں یا آخر میں، اردو میں جلی اور واضح طریقے سے ادا ہوتے ہیں۔ سننے والوں کو ان کا ھائیہ عنصر صاف سنائی دیتا ہے۔ بھائی اور پھوپی وغیرہ کلمات کا پہلا جزو ھائیہ ہے لیکن میں نے بعض لوگوں کو 'بھابھی' اور 'پھوپھی' بولتے سنا ہے جو غالباً ھائیہ کے نمایاں تلفظ کا اثر ہے۔ اس کے برعکس اردو کے دائیں بائیں آگے پیچھے بولی جانے والی زبانیں پنجابی، سندھی، راجستھانی، گجراتی نیز بنگالی 'ہ' کے ساتھ جو ہے وہ تنہا ہو یا کسی حرفِ صحیح کے ساتھ مخلوط، کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتیں۔ کہیں اسے گرا دیا جاتا ہے اور کہیں ہمزہ کی طرح اس کا تلفظ کیا جاتا ہے۔

ماضی مطلق سنسکرت حالیہ تمام سے ماخوذ ہے۔ سنسکرت میں حالیہ تمام اگر لازم ہے تو معروف ہوگا۔ جیسے سہ گتہ (وہ گیا)، سہ چلتہ (وہ چلا) لیکن حالیہ تمام متعدی معروف بھی ہو سکتا ہے۔ اور مجہول بھی۔ سہ مارتہ (وہ مارا گیا) مجہول ہے۔ اور تین مارتہ (اس نے مارا) معروف۔ حالیہ تمام متعدی معروف کے استعمال کی سنسکرت میں دو صورتیں ہیں۔ بطور مجہول، اس صورت میں فعل مفعول کے مطابق ہوگا۔ جیسے "تین بھکتم کھادتم" (اس نے بھات کھایا)، "تین روٹکا کھادتا" (اس نے روٹی کھائی)۔ ان مثالوں میں 'بھات' اور 'روٹی' مفعول ہیں اس لئے پہلی مثال میں 'کھادتم' 'بھکتم' کے مطابق بے جنس ہے (اردو میں 'کھایا' بھات کی نسبت سے مذکر ہے) اور دوسری مثال میں 'روٹکا' کے تعلق سے کھادتا مونث ہے (اردو میں 'کھائی' مونث ہے اس لئے کہ روٹی مونث ہے)۔ دوسرے بطور نا مجہول، اس صورت میں فعل ایک حالت پر قائم رہے گا۔ مفعول کی تبدیلی سے فعل میں تبدیلی نہ ہوگی۔ جیسے "تین راجنہ کرتہ درشتم" (اس نے راجہ کو دیکھا)۔ اس مثال میں 'راجہ' مذکر ہے اس کے باوجود "درشتم" بے جنس ہے۔

اردو اور پنجابی نے سنسکرت کے ان استعمالات کو برقرار رکھا اور ان میں کوئی

رد و بدل نہیں کیا۔ دوسری جدید زبانوں نے ان میں سے کسی استعمال کو قائم رکھا اور کسی میں تھوڑا بہت تصرف کر لیا۔ بنگالی، آسامی، بہاری اور اڑیا نے مجہول کو معروف بنا لیا۔ اور راجستھانی، گجراتی نے مجہول و نامجہول کو ملا کر ایک نیا مرکب گھڑا جیسے تے نے استری نے ماری (بجائے ماریں) اردو میں گجراتی محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ ہوگا۔ اس نے استری کو ماری (بجائے مارا)۔ مغربی پنجابی اور سندھی نے قدیم مجہولی استعمال کو برقرار رکھا لیکن اس میں فاعلی ضمیریں شامل کر دیں اور اس طرح مجہول و معروف کا ایک نیا مرکب تیار کر لیا۔ جیسے کتاب پڑھیم (کتاب پڑھی میں میں نے کتاب پڑھی) اس میں پڑھی کتاب کے مطابق جو مفعول ہے مؤنث ہے۔ بطور مجہول ہوا اور پڑھی کے ساتھ متکلم کی ضمیر 'م' فاعلی حالت میں ہے۔ یہ طور معروف ہے۔ قاعدے کے مطابق اسے فاعل (آلی) یا نائب فاعل ہونا چاہیے۔ اردو میں حالیہ تمام متعدی مجہول کا استعمال بھی دیکھا گیا ہے۔ جیسے وہ مارا یعنی وہ مارا گیا لیکن یہ شاذ و نادر ہے۔

پنجابی نے فعل ماضی کے یہ استعمالات اردو سے لئے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اردو میں ان استعمالات کی بے قاعدگی اور لہندا میں (جو اصل پنجابی ہے) ان کی ہمواری ہے۔ اس کے علاوہ قدیم حالیہ ناتمام کی 'ت' جیسا کہ میں نے چوتھے باب میں عرض کیا اردو میں برقرار رہی پنجابی نے اسے 'د' سے بدل لیا۔ کرتا - چلتا (اردو) کردا - چلدا - (پنجابی) ان تفصیلات کے بعد ڈاکٹر گریرسن کی یہ رائے حرف بحرف صحیح معلوم ہوتی ہے[1]:-

"سنسکرت گرامر اہم نقطہ میں اس قدیم ہندی بولی کی نمائندہ ہے جس سے ہندوستانی نے ارتقا پایا۔ سنسکرت گرامر کی رو سے ہم اردو کی ساخت کی وضاحت کر سکتے ہیں۔"

---

[1] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۵۔

پراکرت دور میں دو یا دو سے زیادہ حروف و حرکات کا اجتماع جائز تھا۔ تلفظ میں اس کو ثقیل، مکروہ، یا ناروا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جدید آریائی زبانوں نے اسے مکروہ سمجھ کر حروف کو گرانا شروع کیا۔ تخفیف کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ ایک حرف گرنے سے کلمے میں جو کمی آئی ماقبل حرکت کھینچ کر اس کی تلافی کر دی گئی۔ جہاں دو حرکتوں یا علتوں کا اجتماع ہوا وہاں دونوں کو ضم کر کے ایک طویل یعنی کشیدہ حرکت یا علت بنا دی گئی یا پہلے ایک حرکت یا علت گرا کر دوسری اس کے عوض میں کھینچ دی گئی۔ حرف یا حرکت کے عوض میں اس طرح طویل حرکت یا علت وجود میں آئی۔ مثلاً (ABBA) میں دو 'ب' جمع ہو گئی تھیں اور (ABAA) میں دو حرکتیں۔ پہلی صورت میں ایک 'ب' گرا کر اس سے پہلے 'A' کو کھینچا تو ĀBA (آب) بنا۔ دوسری صورت میں آخر سے ایک A گرا اور دوسرا طویل ہوا تو (ABĀ) (ابا) وجود میں آیا۔ پراکرت کے ان کلمات کو، جن میں حروف و حرکات کا اجتماع ہوا تھا۔ اردو اور اس کی ہم سر دوسری نئی آریائی زبانوں نے اس نہج سے کاٹ تراش کر ہلکا بنا لیا۔ پراکرت کے جو کلمے حرکتوں اور حرفوں کے اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے ناتراشیدہ اور کسی قدر ان گڑھ ہو گئے تھے اور زبان پر بوجھل اور کان کو ناگوار ہوتے تھے اردو میں آ کر بن سنور گئے۔ اردو نے ہر قسم کے حروف و حرکات کا اجتماع ناپسند کیا۔ حرفوں کی گٹھ جوڑ یا کانا پھوسی اس کی طبع نازک کو گراں گزری۔ 'ن' اور حرفِ صحیح کا اجتماع بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ لیکن یہاں 'ن' کو گرانے کی بجائے غنہ کر کے ہلکا کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اسے غنّہ کرنے کے بعد ماقبل حرکت کھینچ دی گئی۔ سنسکرت چندر پراکرت چند اردو میں چاند ہے۔ اور کھنڈ کھانڈ، دنت دانت، شنڈ سونڈ، بندھ باندھ ہے۔

پنجابی کو پراکرت کے مشدد حروف بھی گوارا ہو گئے۔ 'ن' اور حرفِ صحیح کا اجتماع بھی اس نے برداشت کر لیا۔ اس لئے ہتھّ۔ کنّ۔ تن۔ اکّ۔ کھنڈ۔ منگ وغیرہ کہے

اس کے یہاں موجود ہے لیکن دو حرکتوں کا اجتماع اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اردو کی طرح دو حرکتوں کو مدغم کر کے یا ایک کے عوض میں دوسری کو کھینچ کر وہ تمام کلمے اس نے وضع کر لئے جو الف پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً گا کا 'کیتا' وغیرہ ان کلمات کی وضع میں اوپر سمجھا چکا ہوں یہاں 'گا' کی مزید وضاحت کئے دیتا ہوں۔ گت ۔ گد ۔ گ ۔ گا۔

کیا یہ اردو کا اثر نہیں؟ اگر اردو کے مشدد کلمات پر پنجابی کی چھاپ ہے تو پنجابی کے الف پر ختم ہونے والے کلمات پر اردو کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اب میں دو ایک کلمات کا ذکر کروں گا۔

(۱) آپ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں تعظیمی ضمیر کے طور پر مستعمل ہے جو سنسکرت آتمن اور پراکرت اپن سے لیا گیا ہے۔ اس پر اردو کی چھاپ ہے۔ اس کی ایک 'پ' گرا کر اس سے پہلے الف کو کھینچ دیا گیا۔ قدیم پنجابی میں یہ اپّو تھا۔ ڈاکٹر چٹرجی کہتے ہیں، یہ لفظ مغربی ہندی (ہندوستانی یا اردو) کے علاقے میں پیدا ہوا۔ وہاں سے دوسری آریائی زبانوں میں پہنچا۔ اس کا تعظیمی استعمال اردو سے لیا گیا ہے[1]۔

(۲) امر تعظیمی کریے۔ جائیے وغیرہ کی 'یے' کو ڈاکٹر گریرسن اردو سے ماخوذ بتلاتے ہیں۔

(۳) سنسکرت 'جہوا' پراکرت جبّھا اردو میں تخفیف و تسہیل کے بعد جیبھ بنا۔ پنجابی میں بھی جیبھ ہے۔

(۴) سنسکرت جُشٹھا پراکرت میں جٹّھا ہوا۔ اردو نے جیٹھا بنایا۔ پنجابی نے گھسکر جیٹھ کر لیا۔

(۵) ارشٹھ، پراکرت رِٹّھا، اردو ریٹھا (یائے معروف) پنجابی ریٹّھا (یائے معروف و تشدید 'ٹھ')

---

[1] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۲۰

(۶) سنسکرت کرتہ، پراکرت کتا یا کدا، پنجابی کیتا۔

ان کلمات کی بابت معروف پکار پکار کہہ رہی ہے کہ یہ کلمے تسہیلی رجحان کی پیداوار ہیں، پنجابی نے اردو سے لیے۔ پروفیسر ٹرنر کی رائے بھی یہی ہے[۱]۔

(۷) نیتا۔ اسرار فریدی میں ہے: "آپنے نال نہ نیتا"۔ پنجابی نے اردو کے اثر سے یہاں "ی" نہیں گرائی اور "اپنے" کے الف کو کھینچ کر "آپنے" کر دیا۔

یہ اخذ و استفادے کا پہلا دور تھا۔ اس میں پنجابی، گجراتی، راجستھانی وغیرہ زبانیں قدیم اردو یعنی مغربی ہندی سے متاثر ہوئیں گریرسن کہتے ہیں:۔

"درمیانی گروہ کی زبانوں میں مغربی ہندی نمائندہ زبان ہے۔ پنجابی قدیم پشاچی (جو مغربی پنجابی کی اصل ہے) اور مغربی ہندی کی ماں شورسینی پراکرت کے اختلاط و ارتباط کا نتیجہ ہے۔ راجستھانی جنوب مغرب کی طرف مغربی ہندی کے بہاؤ کو پیش کرتی ہے۔ گجراتی اس بہاؤ کا انتہائی نقطہ ہے[۲]۔"

دوسرے دور میں اردو نے پنجابی اثر قبول کیا۔ اس کا ذکر میں اس باب میں کروں گا۔ جہاں قدیم اردو اور اس کی مختلف بولیوں پر بحث ہوگی تیسرے دور کا آغاز جیساکہ میں نے اوپر عرض کیا تیرھویں صدی سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور دلی نے برصغیر پاک و ہند کے لیے سیاسی، علمی، تہذیبی، لسانی، ادبی، معاشرتی مختصر یہ کہ ہر اعتبار سے دل کی حیثیت اختیار کی۔ ہر تحریک جو دہلی سے اٹھی اٹھی لہریں ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچیں۔ ڈاکٹر چٹرجی فرماتے ہیں[۳]:۔

"دہلی دربار کے اقتدار اور انیسویں صدی میں اردو یعنی مسلمانی ہندی کے قیام و

---

[۱] ملتانی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ صفحہ ۲۲۔
[۲] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ۔ ج ۹۔ حصہ اول۔ صفحہ ۱۔
[۳] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۱۵۔

استحکام کے بعد سے، جو ہندوستان میں اسلامی فکر و تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے، ہندوستانی کو لسانی علاقہ واپس ملا اور اس نے پنجابی اور پشتو تک کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔"

ڈاکٹر گریرسن نے مذکر اسما کے آخری الف اور علامت فاعل (آلی) "نے" کو پنجابی سے ماخوذ بتایا تھا، میں سطور بالا میں ان پر مفصل بحث کر کے دکھا چکا ہوں کہ پنجابی نے یہ لاحقے اردو سے لیے۔ "کا" علامت اضافت گریرسن کی رائے میں اس زبان کی پیداوار ہے جو کبھی سارے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی۔ اور یہ قدیم ہندوستانی ہے۔ آج کی پنجابی میں اس کا استعمال نہیں ہوتا لیکن بارھویں صدی کے لگ بھگ پنجابی 'دا' کے مقابلے میں 'کا' زیادہ استعمال کرتی تھی۔ مولانا شیرانی نے بہت سی بستیوں کے نام گنائے ہیں جن میں 'کا' ہے۔ یہ 'کا' پنجابی نے اردو سے لیا۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں[1]:۔

"ان مقامات کے ساتھ اردو کی اضافت کا موجود ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اضافات پنجاب میں قدیم الایام سے ہیں اور ایک وقت استعمال میں آ رہی تھیں۔ لیکن جب موجودہ پنجابی کی لہر ملک پر چھا گئی۔ پرانی زبان کا شیرازہ بکھر گیا۔"

سکھوں کی مقدس کتاب آدگرنتھ میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس پر قدیم ہندوستانی کی گہری چھاپ ہے۔ گرو نانک کے سوانح حیات جنم ساکھی کی تصنیف کا زمانہ ۱۶۵۰ء بتایا جاتا ہے۔ ساکھی کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر سد ھیشور ورما لکھتے ہیں کہ اس میں ہندی، پنجابی اور لہندا کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ یہ ایک راہرو کی زبان ہے جو اپنی زبان بھول چکا ہے۔ اور جہاں جاتا ہے وہاں کے بسنے والوں کے لسانی ماحول کے مطابق اپنی زبان ڈھال لیتا ہے۔ آر۔ سی۔ ٹمپل۔ نے ۱۸۸۲ء میں پنجاب کے لوک

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۲۹۳

گیت شائع کیے تھے۔ ان میں بیشتر گیتوں کی زبان اردو آمیز پنجابی ہے۔ بلکہ بعض بعض گیت خالص اردو میں ہیں، جو پنجابی پر اردو واثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مولانا شیرانی نے پنجابی اردو کے جو نمونے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ "موجودہ پنجابی کی لہر آنے سے پہلے پنجاب کی زبان کا رنگ و آہنگ کیا تھا۔ شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ تیرھویں صدی عیسوی کے بزرگ ہیں۔ ملتان کے قصبہ کوتوال میں پیدا ہوئے اور ضلع منٹگمری کے قصبہ پاک پٹن میں ۱۲۶۹ء میں وفات پائی۔ مولانا شیرانی نے ان کے دو چار اقوال تاریخی کتابوں سے انتخاب کر کے لکھے ہیں۔ انہیں میں اوپر کہیں درج کر آیا ہوں۔ وہ خالص اردو میں ہیں۔ مولانا شیرانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں[۱]۔

"ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اردو زبان ساتویں صدی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی ہے۔"

شہاب الدین غوری نے دہلی اور میرٹھ کو ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں فتح کیا۔ اس کے بعد "لاکھوں انسان ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہوئے"۔ اگر یہ لاکھوں انسان پنجابی بولتے ہوئے دہلی گئے تھے۔ اور اس وقت موجودہ اردو کا کوئی تصور تک نہ تھا تو شیخ فریدالدین کی زبانِ مبارک پر اردو کے وہ فقرات کیسے جاری ہوئے جو اردو کے امتیازی خط و خال نمایاں کرتے ہیں۔ کیا پنجابی زبان دہلی پہنچتے ہی شُدھ ہو گئی، دہلی کی آب و ہوا نے اس کے خط و خال آن کی آن میں بدل دیے؟ مولانا کا یہ فرمانا کہ اہلِ پنجاب ان ایام میں (چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں کے شروع میں) اردو بول اور سمجھ سکتے تھے" صرف اس صورت میں قابل قبول ہو سکتا ہے جب اردو پہلے سے موجود ہو اور پنجابی سے الگ ایک آزاد اور مستقل زبان کی حیثیت رکھتی ہو۔

[۱] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰۱

مولانا نے ذیل کی غزل حضرت بابا گنج شکرؒ کی طرف منسوب کی ہے۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادمِ خود ہم دم و ہشیار باش — صحبتِ اغیار بری بات ہے
با تنِ تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پندِ شکر گنج بدل جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

یہ خالص نکھری ہوئی زبان اگر بابا فرید کی ہے تو ماننا پڑے گا کہ تیرھویں صدی کے شروع ہی میں اردو دہلی سے ہجرت کر کے پنجاب پہنچ چکی تھی۔

جنم ساکھی میں اردو اثرات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) کھوٹے کو سٹ دیتا ہے (کھوٹے کو پھینک دیتا ہے) صفحہ ۹۵

(۲) اسی تانڈے پیر دی ملاقات کو جاتے اہے (ہم تمہارے پیر کی ملاقات کو جا رہے تھے۔) صفحہ ۴۶

جملۂ اولیٰ میں "سٹ" صرف ایک لفظ پنجابی ہے۔ باقی پورا جملہ اردو ہے۔ دوسرے جملے میں "ملاقات کو جاتے" اردو ہے۔ اس ایک جملے کو چھوڑ کر جس میں تانڈے (تمہارے) استعمال ہوا ہے۔ جنم ساکھی میں عام طور سے تیرا، میرا، وغیرہ اردو کی ضمیریں برتی گئی ہیں۔ جنم ساکھی کے ایک حصے میں گرو نانک کی بابا فرید سے ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ گرو نانک کے ہم عصر بزرگ ہیں جنہیں غلطی سے لوگ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ سمجھتے ہیں۔ اس حصے کی زبان ہندی آمیز پنجابی ہے۔ اس میں پنجابی کے عام رواج کے خلاف فعل متعدی 'وا' کے اضافے سے بنتا ہے۔ جیسے سر کپھڈیا (سر کٹوایا) اور متعدی المتعدی 'لا' اور 'ا' کے اضافے سے جیسے مکلایا (چھڑایا)

اب میں پنجابی پر اردو کے وہ اثرات دکھاؤں گا جو کسی قدر جدید ہیں اور

دہلی کی مرکزیت کے بعد کی پیداوار ہیں۔

(۱) کس بمعنی کس۔ جیسے۔

کس منترے کنے ھنسا منڑایہ نہیں پھلتے (گیت ۱۵۶)

(۲) کسی بمعنی کسی۔ جیسے ۔

اساں جو کسی دیاں نہیں گرجاں (غرضاں) (گیت ۳۱)

(۳) بڑے بڑے بجائے وڈے وڈے۔

کھایاں 'بلے' بیرا بڑے بڑے گراہیں (گیت ۴۲)

(۴) بیچ بجائے وچ۔

ٹبا بیچ بہی کرے گڑق (گیت ۱)

(۵) راتیں بڑیاں بجائے راتاں وڈیاں۔

دن تھوڑے راتیں بڑیاں (گیت ۵)

(۶) ہاتھ بجائے ہتھ۔

بنی رُ مہندی گوریاں دے ہاتھ (گیت ۲۱)

(۷) میرا من بجائے ساڈا من۔

میرا من تیں لیا لچ (" ")

(۸) لڑکے (بصورت منادیٰ) بجائے منڈیا۔

بے لڑکے سبے لڑکے (گیت ۳۵)

(۹) چھوڑدے بجائے چھڑدے۔

کتھر کھانے دا جانا چھوڑدے (" ")

(۱۰) پاس بجائے کول۔

توں، تاں رہ اپنیاں سسّوے پاس (گیت ۴۵)

(۱۱) آکھ بجائے اکھو۔

جیہ تے جھٹ پٹ آکھاں نج (گیت ۵۰)

دے، دیوے دکھائی

(۱۲) باپو بجائے بپّو جیسے آپ بجائے اپّو۔

اماں جوہ چھپنی، باپو چھپنی جائی ہاں (گیت ۲۲)

(۱۳) اردو اور پنجابی میں مرکب افعال بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ دو مختلف مصادر کی ترکیب سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لئے ایک نیا فعل وضع کرنے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج تھا۔ پنجابی نے اوّل اوّل مصدر کے آخر میں 'ی' بڑھا کر مرکب افعال وضع کئے۔ جیسے بہی جا (بیٹھ جا) چلی رہ (چل رہ) ہنسی پانا (ہنس پڑنا) بعد میں اردو کی دیکھا دیکھی اس نے 'ی' گرا کر سادہ مصادر کی ترکیب سے افعال وضع کرنے شروع کئے۔ قدیم پنجابی سے 'ی' کے اضافے کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) بہی جا۔ بیٹھ جا

آ، میرے توتو بہی جا پنجریں (گیت ۵)

(۲) رُسی بیٹھنا۔ روٹھ بیٹھنا

مہا دیب رسی بیٹھا منگد اگدو کھرو (گیت ۱۵)

(۳) چلی رہنا۔ چل رہنا

چلی رہیں گے اکیو ساتھ (گیت ۲۱)

(۴) آئی جانا۔ آجانا

سیج بچھائی آئی جا (گیت ۲۳)

(۵) سوئی جانا۔ سوجانا

جیہلو سوئی ہیں جا نگھا (〃 〃)

(۶) ہسی پانا ۔ ہنس پڑنا ۔

توں ، تاں ہسی الو ، پئی (گیت ۲۹)

(۷) روئی جانا ۔ رو جانا (رو پڑنا)

ہیتے ریئی گیا (میں رو پڑا) (گیت ۳۰)

(۸) لئی دینا ۔ لا دینا ۔

کبھی لونج دی لئی دے (گیت ۳۱)

(۹) ملی جانا ۔ مل جانا

آئی ملی جا (گیت ۳۲)

(۱۰) آئی بیٹھنا ۔ آ بیٹھنا ۔

آئی بیٹھا ٹھنڈے باگ (گیت ۳۸)

مولانا شیرانی فرماتے ہیں :-

ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دکھائی دیتی ہے ۔ کیونکہ زمانۂ مابعد میں ہریانی اپنی اصل حالت پر قائم رہی ۔ اردو میں دہلی کے محاورے اور شعراء کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے ۔ موجودہ اردو ہریانی کی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے ۔

یہ درست ہے کہ ہریانی ایک قسم کی اردو ہے لیکن اس میں شبہ ہے ۔ کہ اردو ہریانی کی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے ۔ ہریانی اپنی اصلی حالت پر کیوں قائم رہی ؟ دہلی کے محاورے کہاں سے آئے ؟ اور کس زبان کے ہیں ؟ شعراء نے زبان میں تصرفات کیوں کئے اور انہیں یہ حق کس نے دیا ؟ ان کے ان تصرفات کو عوام نے کس لئے قبول کیا ؟ کیا زبان کبھی انفرادی تصرفات کی بنا پر اتنی بدلی ہے کہ وہ ایک نئی زبان کی شکل میں جلوہ نما ہوئی ہو ؟ ان سوالات کا جواب دیئے بغیر مولانا شیرانی

کے مذکورہ بالا نتیجے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

ہریانی کا وجود ہی لسانی اخذ و استفادہ کا رہین احسان ہے۔ قدیم اردو نے جمنا عبور کر کے جب مغرب کی طرف قدم بڑھایا تو اس کی مڈبھیڑ ایک طرف پنجابی سے ہوئی دوسری طرف راجستھانی کی ایک اہم بولی میواتی سے۔ حصار کا ضلع مغربی ہندی، پنجابی اور راجستھانی کا سنگم تھا جہاں یہ تین بولیاں ساتھ ساتھ بولی جاتی تھیں۔ ہریانی مغربی ہندی (ہندستانی یعنی اردو) کی نمائندگی کرتی ہے۔ اصلاً وہ اردو ہے، پڑوس کی بولیوں نے اپنے اثر میں لے کر اسے دہلی کی اردو سے مختلف بنا دیا۔ اردو اس کی اصلاح شدہ شکل نہیں، وہ اردو کی مسخ شدہ شکل ہے۔ اردو میں دہلی کے محاورات اور شعرا کے تصرفات کی بنا پر تغیرات واقع نہیں ہوئے۔ ہریانی کو پنجابی راجستھانی اثرات نے بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ ڈاکٹر گریرسن فرماتے ہیں:-

"وہ (ہریانی) بالائی دوآبے کی بول چال کی ہندوستانی ہے جسے پنجابی اور راجستھانی عناصر کی آمیزش نے بہت کچھ مسخ کر دیا ہے۔"

ہریانی پر پنجابی راجستھانی اثرات میں سے چند قابل ذکر ہیں:-

(۱) ہریانی کی نمایاں ترین خصوصیت، جو اس نے پنجابی اور راجستھانی سے اخذ کی، یہ ہے کہ وہ اسما کی غیر فاعلی حالت میں 'اں' کے اضافے سے جمع بناتی ہے مثلاً

انہاں نے پان سے روپیاے کے راج چھوڑ دیا۔

(۲) راجستھانی کے اثر سے ہریانی میں 'ہے' کی جگہ اور اس کے معنی میں 'سے' اور اس کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔

واحد	جمع
سوں - ساں	سیں - بیں - ساں
سے - سے	سو

سے ۔ ــسے　　　　　سیں ۔ ریں

(۳) 'ن' کا 'ڑ' سے تبادلہ پنجابی کا اثر ہے

(۴) ہریانی کا میلان 'ڑ' کی جگہ 'ڈ' کی طرف ہے۔ یہ بھی پنجابی ہی کا اثر ہے جیسے
بڈا (بڑا) پڈھناں (پڑھنا) گڈا (گڑھا) ساڈھو (ساڑھو)

(۵) پنجابی کی ریس میں ہریانی درمیان کے حروفِ صحیح مشدد کر کے ماقبل حرکت
کو کوتاہ کر لیتی ہے ۔ جیسے
چلّیا ۔ کھلّیا ۔ لکّے ۔ بھتّر ۔ بھتّکا ۔ کلّ ۔ رجّی ۔ (راضی)

(۶) 'نے' کا مفعولی لاحقے کے طور پر استعمال اگر گجراتی سے نہیں لیا گیا تو پنجابی نوں
(کو) کے زیر اثر وجود میں آیا۔ جیسے پردیس نے (پردیس کو)

(۷) تے (سے) اوہ (وہ) نیڑے (نزدیک) ترت (چلنا) وغیرہ الفاظ پنجابی
سے لیئے گئے ہیں ۔

(۸) پنجابی کی طرح ہریانی صیغہ واحد متکلم 'ں' کے اضافے سے بناتی ہے جیسے
کراں گا (کروں گا)

(۹) اسم حالیہ اور فعل حال میں پنجابی کی طرح 'ت' کی جگہ ہریانی میں 'د' ہوتی ہے۔
ماردا (مارتا)

(۱۰) ماضی مطلق میں ماقبلِ آخر 'ی' کا وجود پنجابی کا اثر ہے۔ جیسے من نے ماریا۔

(۱۱) 'ں' غنہ پنجابی سے لیا گیا ہے مارناں (مارنا)، توں (تو) کوں (کو) نیں (نے) سیں
(سے) وغیرہ ۔

(۱۲) برج کے پڑوس میں واقع ہونے کی وجہ سے ہریانی نے برج کا اثر بھی قبول
کیا۔ حسب ذیل کلمات کی تسہیل برج ہی کا اثر ہے ۔
ھاڈی (ہڈی) سانچ (سچ) کال (کل) ماٹی (مٹی) لاگا (لگا) دوکھ (دکھ)

راکھ (راکھ)۔

ذیل کے کلمات عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں۔

ہاتھا (ہتھا)، باندر (بندر)، باندھ (بندھ)، پھوکنی (پھکنی)، ساتو (ستو)، تاپ (تپ)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اردو/ہندوستانی/دو آبے کی زبان ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتی ہے، آس پاس کی تمام زبانوں نے اس سے فیض اٹھایا۔ ان میں پنجابی بھی ہے اور راجستھانی و گجراتی بھی۔ ایک لحاظ سے یہ زبانیں اردو کے مختلف روپ ہیں۔ ہریانی ان میں درمیان کی کڑی ہے۔

---

(۷)

صرفی نحوی نشوونما

زبان اپنی فطرت میں تغیر پذیر ہے۔ وہ کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی برابر بدلتی اور زمانے کے بہاؤ کے ساتھ بہتی ہے۔ ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ زبان کی رفتار ترقی کی گردشِ لیل و نہار سے کیا نسبت ہے۔ زبان کتنی تیزی سے روپ بدلتی ہے مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں[۱]۔ "زبان دانوں کا قول ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہر زبان میں ایک مانع فرق پیدا ہو جاتا ہے"۔ اگرچہ مولانا کے اس قول کی چنداں اہمیت نہیں اس میں تحقیق کم اور شاعری زیادہ ہے۔ پھر بھی زبان کبھی ایسے دوروں سے گزرتی ہے کہ اس میں تبدیل اور تغیر کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور نصف صدی سے پہلے ہی اس کا حلیہ بدل جاتا ہے۔

اردو بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ ترقی کی راہ اس نے بھی طے کی۔ اسے بھی زمانے کی الٹ پھیر کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہمارے اہلِ علم نے اردو کے حسب و نسب کی تعیین کرتے وقت اردو کو بدستور زمانے کے بہاؤ کے ساتھ بہتا دکھایا اور

---

[۱] آبِ حیات مطبوعہ ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۰

اس کی معاصر بولیوں کو ایک منزل پر ٹھہرا دیا[۱]۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ جب اردو اور اس کی ہمسر بولیوں کے سفر کا آغاز کسی ایک مقام سے ساتھ ساتھ اور قدم بہ قدم ہوا تھا تو کس لئے اردو منزلوں پر منزلیں مارتی چلی گئی اور اس کی رفیقِ سفر تھک کر بیٹھ رہی اردو نے اپنے جگر گوشے تک نوچ کر اپنے سے الگ کر دیے اور اس رفیقِ سفر (پنجابی) نے اپنے قدیم سے قدیم سرمایہ کو بھی سینے سے چمٹائے رکھا۔

کیا اس لئے کہ "دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی شکل میں تبدیلی ہو جاتی ہے[۲]"

یہ خیال کئی وجوہ سے ناقابلِ قبول ہے۔ اول دو یا دو سے زیادہ زبانیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو اس میل ملاپ کا اثر صرف ایک زبان پر نہیں پڑتا، برابر برابر دونوں اثر پذیر ہوتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں کے تعمیری عناصر تخریب کی نذر ہو جاتے ہیں[۳]۔ اردو برج کی ترمیمیں قبول کرتی رہی لیکن برج نے اردو سے اصلاح نہ لی۔ کیوں؟ دوسرے موجودہ اردو ساخت اور اساس کے اعتبار سے موجودہ پنجابی سے مختلف ہے اگر اردو اور پنجابی کے اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ اردو دہلی جانے کے بعد برج سے وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہی تو اصلاً اسے موجودہ پنجابی سے مختلف نہ ہونا چاہیئے۔ تیسرے اردو کے ان اہم عناصر کی کیا توجیہ ہو گی اور انہیں دہلی کی کس زبان سے ماخوذ بتایا جائے گا۔ جو نہ برج میں ہیں اور نہ پنجابی میں، نہ انہیں پنجابی کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ برج سے ترمیم قبول کرنے کا نتیجہ ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ غیرہ علی حالت

---

۱ مولانا شیرانی فرماتے ہیں (پنجاب میں اردو صفحہ ۵)
"اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا۔ اردو زبان سے رفتہ رفتہ خارج ہوتا رہا ہے"

۲ شیرانی: پنجاب میں اردو ص ۷۔

۳ ارل: انگریزی زبان کی لسانیات طبع اول ص ۴۱۔

میں "وں" کے اضافے سے جمع بنانے کا قاعدہ نہ پنجابی میں ہے نہ برج میں۔ اُردو میں یہ قاعدہ کہاں سے آیا؟ دہلی کی جس زبان سے جمع کا یہ قاعدہ لیا گیا اُسے اس زبان کی ترقی یافتہ صورت کیوں نہیں ہو سکتی جو اس نے صرفی نحوی نشو و نما کے بعد اختیار کی۔

چوتھے اس ساری بحث میں دہلی اور میرٹھ کے علاقے میں بولی جانے والی (کھڑی) زبان سرے سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ اس زبان کے وجود کو مولانا نے بھی تسلیم کیا ہے اور یہ مانا ہے کہ یہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی۔ یہ دہلی کی وہ قدیم زبان ہے جس سے ارتقا پا کر موجودہ اُردو وجود میں آئی۔ اس پر میں پہلے تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ یہاں مجھے اس مسئلے کے ایک دوسرے دلچسپ پہلو کو لے کر اردو کا صرفی نحوی نشو و نما اور فطری ارتقاء دکھانا ہے اور اس کے متعلق بعض گمراہ کن غلط فہمیاں دور کرنی ہیں جو بد قسمتی سے اردو دان طبقے میں بہت عام ہیں اور آئے دن پھیلتی جا رہی ہیں۔

مولانا شیرانی مستم اردو اور پنجابی صرف و نحو کے عمیق تقابلی مطالعہ کے بعد جس نتیجے پر پہنچے اس کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے[1]۔

"ان زبانوں (اردو اور پنجابی) میں (آج) جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔" ہریانی اور اُردو کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں[2]۔

"گیارہویں صدی ہجری میں (ہریانی) اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دکھائی دیتی ہے کیونکہ زمانۂ مابعد میں ہریانی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی (کوئی زبان اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتی) اردو میں دہلی کے محاورے (یہ محاورے کہاں سے آئے؟)

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۱۰۳۔
[2] پنجاب میں اردو ص ۱۱۔

اور شعراء کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے۔"

مولانا اردو کے صرفی نحوی نشو و نما اور اس کے فطری ارتقا کو نظر انداز کر کے اردو کے لسانی تغیرات کی ذمہ داری دہلی اور لکھنؤ کے شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے پر ڈالتے ہیں۔ مشہور بھی ہے کہ دہلی میں مظہر جان جاناں اور ظہور الدین حاتم نے اردو زبان میں اصلاح و ترمیم کی بنا ڈالی جو لکھنؤ میں ناسخ کے عہد تک جاری رہی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف سے انیسویں صدی کے نصف تک اردو میں تراش خراش ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں تحلیل کے امور اہلِ علم کی توجہ کے قابل ہیں۔

شعرا کی اصلاح و ترمیم کا تعلق اردو زبان سے نہ تھا۔ شاعری کی زبان یعنی ریختہ تھا۔ حاتم و ناسخ نے اردو کی اصلاح نہیں کی۔ اس زبان کو سنوارا جو ان کے زمانے میں عام طور سے، ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر میں آگے کروں گا، شاعری میں برتی جانے لگی تھی۔ شاہ حاتم نے دیوان زادہ کے مقدمے میں اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے۔ دوسرے یہ اصلاح ان کا ذاتی یا استبدادی فعل نہ تھا۔ وہ اپنی خواہش، پسند اور صوابدید کے مطابق اردو شاعری کی زبان کو نئے قالب میں ڈھالنا نہیں چاہتے تھے، اس انجان بڑھیا کی طرح جس نے شاہباز کی چونچ تراش کر اس کے پنجے قلم کر دیئے تھے۔ اردو میں تراش خراش ان کا منصب نہ تھا۔ اس اصلاح کی ضرورت اس لئے پیش آئی (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں)، کہ دہلی میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو دہلوی شعراء کے سامنے دکن کی اردو شاعری نمونہ بنی۔ انہوں نے دکنی شعراء کی پیروی کی اور ان کی تقلید میں زبان بھی وہی اختیار کی جو دکنی شعراء کے یہاں استعمال ہوئی تھی۔ یہ زبان دہلی کی رائج الوقت زبان سے مختلف تھی۔ میرزا مظہر اور شاہ حاتم شاعری کی اس "دکن زدہ" زبان کو دکنی عناصر سے پاک کر کے دہلی کے روز مرہ سے قریب تر لائے۔ شاہ حاتم فرماتے ہیں:۔

"روز مرۂ دہلی کہ میرزایانِ ہند و فصیح گویاں ... محاورہ دا منظور داشتہ" یا ...

لگے کہ شعرا جانتے تھے کہ جو الفاظ وہ باندھ رہے ہیں اردو نہیں رہ گئے ہیں، اور ٹکسال باہر ہیں لیکن جیسا کہ میر انشاءاللہ خاں نے لکھا ہے[1] شعری ضرورت سے مجبور ہو کر عمداً شعر میں باندھے جاتے تھے۔ نثر میں مجبوری نہ تھی اس لئے یہ غیر ٹکسالی الفاظ نظم میں جڑ پکڑ گئے نثر میں راہ نہ پا سکے۔ مصلحین زبان نے ان الفاظ کے خلاف جہاد کر کے ریختہ کے باغ کو جو دکنی الفاظ کے خس و خاشاک سے اَٹ گیا تھا پاک کیا۔ انشاءؔ فرماتے ہیں[2]:-

"میں ان صاحبوں کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے کئی نامعقول الفاظ ترک کر دیئے۔ جیسے 'متے' بمعنی میں (درمیان) پہلے یہ لفظ شعروں میں آتا تھا، جیسا کہ یہاں کبھو نے کہا ہے:

بہ متے جامہ نہ تھا اک جھول تھی"

مصحفی شعرا کی اصلاح کا دائرہ الفاظ و مرکبات تک محدود رہا۔ اس سے آگے نہ بڑھا۔ ذیل کے الفاظ شاہ حاتم نے متروک قرار دیئے:-

(۱) 'دلا'، 'بر' اور دیگر الفاظ و افعال فارسی۔

(۲) الفاظ ہندی مثل 'نین' و 'جگ'۔

حسب ذیل الفاظ میں انہوں نے ترمیم کی:-

(۱) تسبی کو تسبیح، صحی کو صحیح، بگانہ کو بے گانہ، دوانہ کو دیوانہ۔ مرض (بسکون اوسط) کو مرض (بفتح اوسط)

(۲) ستی کو سے، اودھر کو ادھر، کیدھر کو کدھر، یاں کو یہاں، واں کو وہاں لکھا۔

قریب قریب یہی حال میر و مرزا کی اصلاحات کا ہے۔ ان شعرا نے عربی و فارسی الفاظ کو ترک کیا جن میں شعری ضرورت کی بنا پر کسی قسم کا ناجائز یا مستعمل

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۵۸

[2] ترجمہ دریائے لطافت ص ۵۹

زبان کے مزاج کے خلاف کوئی تصرف ہوا تھا، مثلاً متحرک کو ساکن، ساکن کو متحرک، مشدد کو مخفف، مخفف کو مشدد، مذکر کو مؤنث، مؤنث کو مذکر کر لیا گیا تھا، یا ان کا تلفظ اصلی زبان کے تلفظ کے مطابق نہ تھا، ان میں کوئی حرف زیادہ یا کم کر دیا گیا تھا، یا وہ الفاظ پنجابی، یا دکنی یا برج سے اردو میں چلے آئے تھے اور اب وہ نہ بنے تھے، یا ان کی شکل اور تلفظ اس سے مختلف تھا [illegible] تلفظ کیا جاتا [illegible] دہلی کی [illegible] رکھے گئے تھے جیسے بلگرامی نے متروکات سخن کی فہرست بلا شعر میں درج کی ہے اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

مولانا شیرانی کا ارشاد ہے[1]

"انھوں نے (اردو شعرائے) اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی، مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح و ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی پیدا کر دی ہے۔ قدیم اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی جامع، مفید اور کار آمد تھے۔"

اصلاح و ترمیم کی مولانا صاحب ذیل مثالیں پیش فرماتے ہیں۔[2]

"پرانی جمع کے قاعدے کو انھوں نے بالکل بیکار اور باطل کر دیا۔ اقلیم زبان سے حرف علت و نون غنہ کے اخراج میں ہم ان سے متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن افعال و اسماء سے جمع مؤنث کے ترک کرنے میں ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔"

اردو شعرائے پرانی جمع کے قاعدے باطل کئے اور نہ اقلیم زبان سے حرف علت اور 'ن' غنہ کو نکالا یہ سب کچھ زبان کی تغیر پذیر اور نمو پذیر فطرت کے اندرونی تقاضوں کے تحت سے ہوا۔ مسلمانوں کی سرپرستی میں آنے سے پہلے اردو دہلی اور اس کے نواح میں بولی

---

[1] پنجاب میں اردو ص، ۱۰۳
[2] " " " ص، ۱۰۳

جا رہی تھی۔ اگرچہ اس کی شکل وہ نہ تھی جو آج ہے۔ یا مسلمانوں کی سرپرستی میں آنے کے بعد ہوئی۔ اپنی زندگی کے قدیم دوروں میں اس نے نت نئی صورتیں بدلی تھیں۔ نئے دور میں قدم رکھنے کے بعد بھی وہ نئے نئے روپ دھارتی رہی۔ زبان کی نت نئی تبدیلیوں کا ذمہ دار اُردو شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے کو ٹھہرانا حقیقت کے خلاف ہے۔ قیاس صحیح اس کا موید نہیں حقیقت کے خلاف اس لئے کہ شعرا المصلحین کے کارناموں کی تفصیلات تذکروں میں مرقوم ہیں۔ ان میں صرفی نحوی اصلاحات شامل نہیں۔ اگر شعرا صرفی نحوی اصول و قواعد میں ترمیم و اصلاح کرتے تو تذکرہ نگاروں کی نظریں اس پر ضرور پڑتیں اور وہ اس کا ذکر کرتے۔ قیاس سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی کہ صرفی اصول کی اصلاح و ترمیم یا ان میں کسی قسم کا تصرف شعرا یا تعلیم یافتہ طبقے کے اختیار و اقتدار سے باہر ہے۔ ان کا ہاتھ زبان کے دامن تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے گریباں پر کیا ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

اردو کے صرفی نحوی اصول و قواعد میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوئیں اس میں شبہ نہیں۔ شبہ اس میں ہے کہ یہ ترمیمیں شعرائے اردو کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔ میں کہتا ہوں زبان کی فطرت ہے کہ وہ زمانے کی ہر کروٹ کے ساتھ کروٹ بدلتی رہی ہے۔ مولانا جیسے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی بتاتے ہیں۔ جدید لسانیاتِ لسانیات کا امام یسپرسن اسے زبان کی برتری، تفوق اور اصلاح کی ایک اچھی اور صحت مند علامت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے زبان کے بارے میں جو بحثیں کی گئیں وہ بیشتر لاطائل اور بے سود ہیں۔ ان سے کوئی علمی نکتہ دریافت نہیں ہوا۔ اصل سوال جس کی کوئی اہمیت ہے یہ ہے کہ زبان میں تغیر کا رخ ترقی کی طرف ہے یا تنزل کی طرف؟ زبان روپ بدل کر آگے بڑھتی ہے یا پیچھے ہٹتی ہے؟ اس میں ابتری و برہمی رونما ہوتی ہے یا برتری و ہمواری یسپرسن کہتا ہے[1]۔ کہ مختلف زبانوں کے تاریخی ارتقا کے جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صرفی نحوی اصول کے لحاظ سے

---

[1] انگریزی زبان کی ساخت اور نشوونما طبع سوم ص ۲۴۴

زبان کا عام و فطری میلان ہے کہ وہ ابتری سے برتری کی طرف قدم بڑھائے اور ناہمواری (CHAOS) سے ہمواری (COSMOS) کی طرف قدیمی اصولوں کو جن پہ زبان کی تعمیر ہوئی جامع، مفید، اور کارآمد بتانا جدید نظریہ ارتقا کے منافی ہے۔ اس سے اس نتیجے کی تکذیب ہوتی ہے جس پر جدید لسانیات کے ماہر تحقیق، جستجو اور کاوش کے بعد پہنچے۔ زبان کے قدیمی اصولوں کی جامعیت اگر ان کی کثرت (RICHNESS) وسعت، رنگا رنگی اور تنوع ہے، تو ہو سکتا ہے وہ اصول جامع ہوں، لیکن اس میں شبہ کی گنجائش ہے کہ وہ اصول مفید اور کارآمد تھے۔ اگر وہ مفید ہوتے تو نذر تخریب نہ ہوتے۔ مفید اور کارآمد چیزیں مٹتی نہیں باقی رہتی ہیں پانی کے اوپر کے جھاگ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو جاتے ہیں۔ اور سمندر کی تہہ میں بیٹھ جانے والے موتی جو نفع بخش اور کارآمد ہیں، باقی رہ جاتے ہیں۔ زبان کے قدیمی اصول جن کے ضائع ہو جانے کا مولانا کو افسوس ہے سرے سے بے سود اور غیر مفید تھے۔ اگر مفید تھے تو انسان کی ذہنی و فکری نشو ونما کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ اور حرام گوشت کی طرح زبان کے نو خیز جسم سے چمٹے ہوئے تھے۔ زمانے کے بے رحم ہاتھ نے اس حرام و بے جان گوشت کے لوتھڑے کو زبان کے جسم سے نوچ کر الگ کیا۔ مشہور جرمن ماہر لسانیات کراٹر (KRAUTER) کہتا ہے[۱]

"قدیم صیغوں، اصولوں اور آوازوں کے نقوش دھندلے ہوتے اور مٹتے دیکھ کر دل غم و غصے سے بھر جاتے ہیں لیکن انصاف پسند جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں جانتا ہے کہ یہ ارتقا کی جیت ہے جو اس مردہ اور بے جان مواد پر حاصل کی۔"

مولانا پرانی جمع کے قاعدے کو زبان کی موسیقیت اور خوش آہنگی کا ایک بڑا عنصر قرار دے کر فرماتے ہیں "کیا کوئی شخص مرزا سودا کے ان اشعار کی خوشنوائی سے انکار کر سکتا ہے جو پرانی طرز میں لکھے گئے ہیں۔

---

[۱] بحوالہ لیپرسن "زبان میں ارتقا" طبع دوم ص/ ۱۵ —

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک ہائیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دستِ تاسّف کے تئیں ملتا ہوا
جن نے وہ انکھیاں غبار آلودہ ملیاں دیکھیاں

مولانا زبان کے پرانے "ازکار رفتہ تکلفات کو زبان کے قواعد کا زیور سمجھ کر سودا کے مندرجہ بالا اشعار کی خوشنوائی پر سر دھنتے ہیں۔ اردو کا جملہ :-

"مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں"

جب قدیم اردو قواعد کے مطابق اس طرح لکھا جاتا ہے :-

"مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں"

تو ہمیں ایک حسین گلدستہ نظر آتا ہے۔ مولانا زبان کے جن تکلفات کو قواعد زبان کا زیور سمجھتے ہیں وہ بیان کے قریب قریب اسی نوع کے تکلفات کبھی اسالیب بیان کی زینت سمجھے جاتے تھے۔ مولانا زبان کی موسیقیت و خوش آہنگی پر فریفتہ ہیں۔ لوگ بیان کی خوش نوائی اور نغمہ سرائی پر ریجھے ہوئے ہیں۔ نقطۂ نگاہ ایک ہی ہے یعنی مقصد سے زیادہ ذریعے کی اہمیت، اور جوہر کو نظر انداز کرکے زیور سے لگاؤ۔ زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے، مقصدِ اظہار ہے زبان نہیں، بیان ہے طرزِ بیان نہیں۔ زبان خوش آہنگ ہے اگر مقصد کا سیدھی طرح اظہار کردے طرزِ بیان دلنشین ہے اگر وضاحت اور صفائی کے ساتھ دل کی بات دل تک پہنچادے۔ راسک کہتا ہے[1] :-

"جامع لسانیاتی ساخت جو اسماء و افعال کے رنگارنگ لاحقوں پر مشتمل ہو، اپنے اندر بڑی افادیت رکھتی ہے۔ ۔ ۔ لیکن اس کے مقابلے میں سادگی اور آسانی کے فوائد بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا"

---

[1] بحوالہ "زبان میں ارتقا، ص ۱۴"

یسپرسن لکھتا ہے[1]

"قدیم زبانوں کے بے لگام جامع اور متنوع قاعدے اور اعرابی لاحقے زبان کا حسن نہیں عیب ہیں جنھوں نے زبان کے چہرے کو بھدا اور داغدار کر دیا ہے۔"

اس سلسلے میں فان ہم بولٹ کا یہ قول بھی توجہ کے قابل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان کا حسن اس کی سادگی اور الھڑپن میں ہے۔ زبان وہی حسین و دل نشیں ہے جو اپنے مقصد یعنی اظہار خیال میں کسی رکاوٹ اور پیچیدگی کے بغیر بولنے والے کی مدد کرے۔

"زبان کے معنی ہیں گویائی اور گویائی انسان کا تہذیبی عمل ہے جس کے ذریعے وہ اپنا مافی الضمیر کسی دوسرے انسان تک پہنچاتا ہے۔ زبان وہی بلند مرتبت ہے جو کم سے کم ذرائع کی مدد سے اپنا یہ مقصد پورا کر دے۔ یا یوں کہیے کہ جو زیادہ سے زیادہ مطالب کا اظہار کم سے کم الفاظ اور سادہ سے سادہ اصول میں کر سکے۔"[2]

یسپرسن کے حوالے سے یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قریب قریب ہر زبان میں تبدیلی کا رُخ سادگی اور آسانی کی طرف ہے۔ یسپرسن کہتا ہے کہ آریائی زبانوں کے قدیم ادوار کا جدید ادوار سے مقابلہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ زبان کے جدید ادوار کی صرفی شکلیں مختصر، کمتر، سادہ، باقاعدہ اور کسی قدر عام ہیں۔ اس کے مقابلے میں قدیم دور کے صیغے اور ان کی صورتیں طویل اور پیچیدہ، بے قاعدہ اور متعین ہیں۔ یہ اصول تمام زبانوں میں تفاوتِ درجات کے ساتھ کار فرما رہا ہے[3]۔ آیئے اس اصول کو سامنے رکھ کر اردو کے صرفی نحوی قواعد کا جائزہ لیں۔

سب سے پہلے اختصار کو لیجیے۔ اردو روزِ اول سے "ہرچہ گیرد مختصر گیرد" پر عامل رہی ہے۔ دسویں صدی عیسوی سے پہلے وہ اپ بھرنش دور میں تھی تو اس کے اسماء،

۱؎ بحوالہ "زبان میں ارتقا" ص ۱۴۱
۲؎ بحوالہ "زبان میں ارتقا" ص ۱۳
۳؎ زبان میں ارتقا ص ۱۲۲

افعال، حروف، اسمی و فعلی لاحقے، جن سے تعمیر الفاظ کا کام لیا جاتا ہے، طویل الذیل واقع ہوئے تھے۔ ان میں چند دسویں صدی کے بعد کے دور میں بھی رسے جوگی کی طرح چلے آئے یہ بعد میں چھٹے۔ "کا" قدیم اردو میں "کیا" تھا۔ پہلے "کیرا" ہوا اس کے بعد "کر"۔ کبیر اور تلسی نے "کر" استعمال کیا ہے۔ "ک" (الف علامت تذکیر ہے) اس کی آخری شکل ہے۔ مزید کانٹ چھانٹ کی گنجائش نہیں ورنہ شاید اور تراشتا۔ "ہے" اور "تھا" اردو کے دکنی دور میں "اہے" اور "اتھا" تھے۔ ان کا الف نذر تخفیف ہوا۔ "جگہ" غالباً "جات گاہ" کی تراش ہے جو "جاگہ" ہوتا ہوا "جگہ" بنا۔ متقدمین شعراء کے دورِ دوم تک دہلی میں عام طور سے "جاگہ" ہی بولا جاتا تھا۔ خواجہ میر درد فرماتے ہیں:۔

چلئے کہیں اس جاگہ کہ ہم تم ہوں اکیلے
گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا

"لاگا" (لگا) کا بھی یہی حال ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں:۔

خون جگر ہو بہنے لاگا پلکوں ہی پہ بہنے لاگا

کیدھر، جیدھر، ایدھر، اودھر وغیرہ کلمات کی "ی" اور "و" کی حیثیت "لاگا" اور "جاگہ" کے الف کی سی ہے ان حروف کی بابت مولانا شیرانی فرماتے ہیں۔ "اقلیم زبان سے ان کے اخراج پر ہم متفق ہیں۔ "جاگہ" کو چھوڑ کر باقی کلمات کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ ان کے حروفِ علت "ا، ی، و" اصلی ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں کی رائے[1] ہے کہ یہ حروف بعد کی پیداوار ہیں اور شاید اس زمانے کا طرزِ تحریر ان کی تخلیق کا ذمہ دار ہے۔ قدیم زمانے میں بعض کاتب کتابت میں ضمہ کی رعایت سے "و" اور کسرہ کی رعایت سے "ی" لکھ دیا کرتے تھے۔ اول اول لکھنے میں "ی" اور "و" دبے رہے، بعد میں ان کا اعلان ہونے لگا۔ اس لئے حاتم وغیرہ شعراء مصلحین کو اس طرزِ کتابت اور طرزِ تلفظ کے خلاف جہاد کرنا پڑا۔

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۲۷

'تک' اردو کے اختصار پسند رجحان کی اچھی مثال ہے۔ یہ آج سے تقریباً چار سو سال پہلے 'تولگن' تھا۔ سب رس میں ہے۔ "جو لگن بشریت اس میں باقی ہے تو لگن اللہ کہنے کی مشتاق ہے" (ص ۱۰۹) 'تولگن' سے 'تولگ' ہوا پھر تب لگ۔ اس کے بعد تلک تلک اور تک'۔ 'تو' قدیم زمانے میں 'تاوت' تھا۔ 'تاؤ'۔ 'تو' اُس کے درمیانی صیغے ہیں۔ ایک شکل اس کی 'تب' ہے۔ "تب بھی" کی جگہ اور ان کے معنی میں 'توبھی' (بفتح 'ت' و سکون 'د') آج بھی مستعمل ہے۔ "اگر" یہ بات تسلیم کرلی جائے۔۔۔۔ توبھی میرے نزدیک" (مضامین حالی ص ۲۴۵)

قدیم دکنی اُردو میں ماضی مطلق یائے مخلوط کے ساتھ مستعمل تھی۔ دکنی شعرا نے چلا' پڑھا' دیکھا کو چلیا' پڑھیا' دیکھیا ہی باندھا۔ دہلی کے قدیم شعرا خسرو، افضل اور برہمن سے یہاں مجھے ماضی کی 'ی' نہیں ملی لیکن اس کے کئی قرینے ہیں کہ قدیم اُردو میں 'ی' تھی، جو اردو کی طبع نازک پر گراں ہونے کے باعث بعد میں گر گئی۔ 'کیوں' اور 'کیا' وغیرہ دو چار کلموں میں بچ رہی تاکہ 'کیوں' 'کوں' سے مشتبہ نہ ہو جو کبھی اردو میں 'کو' (لاحقہ مفعول) کی ایک شکل تھی اور 'کیا' 'لاحقہ اضافی' 'کا' سے۔

مولانا شیرانی کا ارشاد "یائے مخلوط قدیم زمانے میں اردو میں ملتی تھی لیکن اب متروک ہے" درست ہے۔ میر نے عربی لفظ 'خیال' کی 'ی' کو 'خ' کے ساتھ ضم کر کے 'خیال' (بر وزن فاع) باندھا اور بقول مولانا آزاد اسے اردو محاورہ قرار دیا۔ لیکن آج کل خالص ہندی الفاظ پیار اور پیاس جو اصلاً مخلوط التلفظ ہیں اعلان 'ی' کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ آج یہ اردو کی فطرت ہے بیونتا (جسم کے مطابق کپڑا قطع کرنا) ۱۸۰۰ء تک مخلوط التلفظ اور بہار و یوپی کے مشرقی اضلاع میں آج بھی مخلوط ہی ہے، لیکن اہلِ اردو اس کا قدیم تلفظ ترک کر چکے ہیں۔ اور 'بیونتا' کی 'ی' کا سا سلوک کر کے بیونتا بولتے ہیں اگرچہ لکھتے بیونتا ہی ہیں۔

قدیم اردو کے بہت سے کلمات کے آخر میں ن غنہ ہوا کرتا تھا۔ یہ ن کہاں سے آیا اور کن حالات میں آیا اس وقت یہ زیر بحث نہیں۔ اس کا ذکر میں اپنے تحقیقی مقالے میں کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بتانا ہے کہ یہ ن بے جان تھا اور امتداد زمانہ کے اثر سے اپنی افادیت ضائع کر چکا تھا۔ اس لئے بیرنگی دوران کی نذر ہوا۔ اردو والے 'نے' کو 'نیں' 'سے' کو 'سیں' 'کو' کو 'کوں' 'کنا' کو 'کناں' بولا اور لکھا کرتے تھے۔ انشاء کہتے ہیں۔[۱]

"یہ شاہ جہان آباد کی زمین کا فیض ہے کہ کلمے کے آخر سے ن غنہ کا دم چھلا اڑ گیا ورنہ سادات بارہہ کے پراتم بزرگ جو اپنے وطن میں رہے۔ 'کو' کو 'کوں' بولتے ہیں۔"

پرانی جمع کے قاعدے کی بابت مولانا فرماتے ہیں کہ "اسے باطل اور بے کار کر دیا گیا" پرانی جمع کے قاعدے سے ان کی مراد شاید لاحقہ 'اں' ہے۔ دکن میں عام طور سے اور دہلی میں اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز سے پہلے مذکر و مؤنث کی جمع 'اں' کے اضافے سے بنتی تھی۔ جیسے ماتاں، جھاڑاں، عمراں، بھائیاں، مائیوں۔ جمع کا یہ قاعدہ پنجابی، سندھی، مارواڑی مشرقی ہندی میں بھی ہے۔ اور اس لحاظ سے قدیم ہے کہ اس کا جوڑ سنسکرت لاحقہ جمع (بے جنس) 'انی' ("الفِ" مکسور) سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اردو کے گہرے تاریخی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'اں' کی جمع اردو میں 'وں' کی جمع سے زیادہ قدیم نہیں۔ اس کی واضح اور ناقابل تردید شہادتیں درج ذیل ہیں:

(۱) سید محمد حسینی گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین دکنی ادب کی دریافت شدہ کتابوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس میں ایک مقام پر (ص ۲۰) کان کی جمع کانوں (وں کے ساتھ) استعمال ہوئی ہے۔

(۲) دکنی شعراء کے یہاں لاحقہ 'اں' کے پہلو میں 'وں' بھی ملتا ہے۔ محمد امین

---

[۱] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۱

دکنی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

وہ دوزخ کی اگن کو رب تے دھوئی　　کئی لاکھوں براں جل میں ڈبوئی

اس میں براں (جمع بہ معنی برس) کی صفت لاکھوں (جمع لاکھ باضافہ 'وں') استعمال ہوئی ہے 'براں' کی صحبت میں 'لاکھاں' یہاں زیادہ خوش آہنگ تھا۔ لیکن شاعر نے لاکھوں استعمال کیا۔

قدیم اُردو اور پنجابی میں اسمائے عامہ یعنی ضمائر، اشارات، موصولات، کنایات حروفِ استفہام کے جمع کے صیغے بول چال اور تحریر کی زبان میں اس وقت استعمال ہوتے تھے جب کثرت پر زور دیا جاتا تھا یا مجموعہ اشیاء اور جمعیتِ افراد کا اظہار مقصود ہوا کرتا تھا یہ طریقہ قدیم سے ان زبانوں میں رائج چلا آرہا تھا۔ اردو کی پرانی کہاوت ہے "چار یار چاروں بیکار" اُردو والوں نے مجموعی حیثیت جتانے کے لئے 'چار' کی جمع بنائی۔ انگریزی میں یہی بات کہنا چاہیں تو ALL وغیرہ کوئی لفظ اضافہ کر کے کہیں گے (ALL THE FOUR) 'سب' معنی جمع ہے اور کثرت و تعدد کا اظہار کرتا ہے۔ اردو میں سبھوں (قدیم زمانے میں سب کا تلفظ سبھ کیا جاتا تھا) اس کی جمع ہوئی۔ کہتے ہیں[1] "سبھوں نے مل کر چھپر اٹھایا" اس کے علاوہ حسب ذیل دوسری جمع کے صیغے اردو میں ہیں:-

انہوں (جمع اُن)، اِنھوں (جمع اِن) جنھوں (جمع جن) کنھوں (جمع کن)

کسی زمانے میں یہ صیغے مغیرہ حالت میں عام طور سے مستعمل تھے۔ اہلِ اردو کہا کرتے تھے "جنہوں کے واسطے ہم نے جان دی۔ انہوں کو ہم خوب جانتے ہیں" لیکن آج ان صیغوں کا یہ استعمال اردو روزمرہ کے خلاف ہے۔ آج یہ صیغے صرف "نے" کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ سے 'کو' 'کا' 'پر' وغیرہ کے ساتھ ان کا استعمال صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ صیغے 'ن' پر ختم ہوتے ہیں۔ ان پر 'ے' بڑھا کر انہوں نے، جن سے

---

[1] انشا "سبھوں نے" کی جگہ "سبھوں نے" مثل پورب والوں کی زبان بتاتے ہیں ص ۲۵

کہیں تو اشتباہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں 'اس نے' اور 'جس نے' کو 'نس' اور 'ن کے' ادغام کے بعد 'نے' اور 'جنے' کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دو نونوں کا اجتماع پسندیدہ اور مستحسن نہیں۔ 'کو' 'کا' وغیرہ حروف مغیرہ ان کلمات پر اضافہ کر کے 'جن کو' یا 'جن کا' یا 'جن سے' 'ان کو' 'ان کا' 'ان سے' لکھنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اس لئے 'نے' کے ساتھ قدیم جمع کے صیغے برقرار ہے۔ 'کو' 'کا' وغیرہ حروف کے ساتھ ان میں تخفیف کر لی گئی۔

بہرحال ان صیغوں کی یہ بناوٹ بھی پرانی ہے اور اغلب یہ ہے کہ جس زمانے میں ان کلمات پر "وں" بڑھایا گیا اردو اور پنجابی میں 'اں' زیادہ کرنے کا رواج نہ تھا۔ ان کلموں پر 'اں' نہیں بڑھایا یہ اپنی قدیم شکل ہی میں رائج رہے۔ پاس پڑوس کے الفاظ کی صحبت نے بھی انہیں متاثر نہ کیا۔ احمد دکنی کے مذکورہ بالا شعر میں 'یہاں' کے پہلو میں 'لاکھوں' استعمال ہونے کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ 'لاکھوں' اردو میں اس وقت بھی تھا جب 'یہاں' نے جنم نہیں لیا تھا۔ وہ مدت سے 'وں' کے ساتھ استعمال ہو رہا تھا۔ بولنے والے اسے واحد سمجھ لئے اور یہ بھول گئے کہ وہ جمع کا صیغہ ہے جسے 'وں' بڑھا کر وضع کیا گیا ہے ورنہ یہاں کے قیاس پر اس کی جمع بناتے۔

'ہم' کی جمع 'ہموں' اور 'تم' کی جمع 'تمہوں' (تم اصل میں 'تمہ' تھا) انہوں کے قیاس پر اردو قاعدے اور اس کے مزاج کے مطابق بنائی گئی۔ امین دکنی کہتا ہے:-

ہموں نے دیکھ کر اس گھا دکھائی۔

'ہمن' اور 'تمہن' پر بھی قاعدے سے بنیں۔ چندربھان برہمن کا شعر ہے:-

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

سعدی کاکوروی کہتے ہیں:- ہمنا تمہن کو دل دیا۔ تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پریت ہے

مولانا شیرانی فرماتے ہیں[1]: "ہم کی شکل ہماں، ہموں اور ہمیں ہونی چاہیے لیکن ہماں نہ آج ملتا ہے نہ پرانے شعرا میں۔ 'ہموں' متاخرین نے ترک کر دیا۔ 'ہمیں' خدا کے فضل سے آج بھی زندہ و سلامت ہے۔" 'ہموں' اور 'ہمیں' (بیائے مجہول) میں بڑا فرق ہے۔ 'ہموں'، 'ہم' کی جمع ہے جسے 'وں' بڑھا کر وضع کیا گیا۔ اس کی نوعیت وہی ہے جو 'انہوں' اور 'جنہوں' کی ہے۔ 'ہمیں'، 'ہم' کی مفعولی (ثانوی) حالت ہے۔ 'یں' اس میں مفعولی ہے، 'سے'، 'مجھے'، 'تجھے'، 'اُسے' وغیرہ مفرد ضمیروں میں بھی ہے[2]۔ 'ہماں' مولانا کو پرانے شعرا کے یہاں اس لئے نہیں ملا کہ جب 'ہموں' وضع ہوا تو 'اں' کی جمع کا قاعدہ نہ تھا۔ یہ قاعدہ اُردو کا قدیمی قاعدہ نہیں، بعد کی پیداوار ہے اور باہر سے لیا گیا ہے۔ فارسی کے اثر سے یہ اُردو میں آیا۔ اول اول اہلِ اردو نے اس کو عربی فارسی الفاظ تک محدود رکھا اور فارسی قاعدے کے خلاف صفت یا اضافت کے بغیر فارسی و عربی الفاظ کی جمع 'اں' سے بنائی جیسے:

گل بہاریں سن کے جیب کردیں بلبلاں صدا

ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھ محبوباں کی چال

زلفِ خوباں کی ہوئی ہے مرے جی کو جنجال

اہلِ دکن نے غالباً راجستھانی کے زیرِ اثر اس قاعدے کو عام کر دیا۔ وہ ہندی لفظوں پر بھی یہ عمل کرنے لگے۔ اور پہاڑ کی جمع پہاڑاں، بات کی جمع باتاں بنانے لگے۔ عطف و اضافت کے باب میں بھی انہوں نے یہی کیا تھا اور حدود کی رعایت نہ کر کے ہندی و فارسی (یا عربی) لفظوں کے مابین عطف و اضافت کا اصول برتا تھا۔

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۱۴۳

[2] اس مقام پر مولانا نے یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہیں کیا اور کہیں، نہیں وغیرہ کو جن میں یائے معروف ہے 'ذاتیں' اور 'ہمیں' کے ہم وزن اور مساوی قرار دیا۔ 'لڑکیں' اور 'ہمیں' اگرچہ ہم وزن ہیں۔ دونوں میں لاحقہ 'یں' ہے لیکن 'ہمیں' کا لاحقہ مفعولی ہے۔ اور 'لڑکیں' کا جمعیت کے لئے۔

اُردو میں 'ں' کے عام طور سے رواج پا جانے کے بعد جمع کے قاعدوں میں تھوڑی اور ایک طرح کی ابتری رونما ہوئی۔ کہیں 'وں' سے جمع بنائی گئی کہیں 'اں' سے کہیں 'یں' سے اور کہیں حرف 'ے' سے۔ یہ زبان کی سادگی اور اصول پسند مزاج کے خلاف تھا۔ اُردو نے اس میں کانٹ چھانٹ کی۔ اصل انتخاب کو برتا، باقاعدگی پیدا کی جو زبان کا اصلی جوہر ہے 'اں' 'ی' پر ختم ہونے والے مؤنث اسمائے کے ساتھ مخصوص ہوا۔ باقی مؤنث اسمائے قائم حالت میں 'یں' سے جمع ہی اور مذکر اسمائے کی جمع 'ے' سے بشرطیکہ وہ الف پر ختم ہوں۔ "محل" ہر اسم کو برابر کا حصہ ملا۔ تمام اسمائے مذکر ہوں یا مؤنث، الف پر ختم ہوئے ہوں یا 'ے' پر مغیرہ حالت میں 'وں' کے اضافے سے جمع بنائے گئے۔ یہ اردو کا کلیہ قاعدہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی اردو نے ان تمام صیغوں کو چھانٹ دیا جن کا کوئی مصرف نہ تھا یا جو زبان کے ارتقا کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکے تھے اور بے جان ہو گئے تھے دونوں، تینوں کے قیاس پر متقدمین کے عہدِ اول میں ایک لفظ 'ایکوں' وضع ہوا تھا میر صاحب فرماتے ہیں:۔

ایکوں کی کھال کھینچی ایکسوں کو دار کھینچا

یہ لفظ قلمرو زبان سے خارج ہوا۔

کنھوں سے، کنھوں کو، پر خطِ نسخ کھینچا کن سے، کن کو، ان کے مقابلے میں مختصر اور سادہ تھے اور انشا کے خیال کے مطابق ان پر باہر کی چھاپ بھی نہ تھی۔ انشا ایک مقام پر فرماتے ہیں[1]۔ دراصل 'کنھوں' پنجابی ہے۔ اردو کے اکثر فصحاء اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے۔ انھوں کا بیٹا لاہور کی زبان ہے[2]

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۴۲
[2] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۷۰

اُردو میں میر و میرزا کے عہد تک ی پر ختم ہونے والے افعال و صفت کی حسب قاعدہ ں بڑھا کر جمع بنائی جاتی تھی۔ کڑی کی جمع کڑیاں بھلی کی بھلیاں ہوتی تھی آئی کی آئیاں اور جاتی کی جاتیاں۔ مثلاً

ہاں وصل کی راتیں آئیاں ظالموں نے صبح کر دکھلائیاں

تو کا قاعدہ تھا موصوف جمع مؤنث ہے تو اس کی صفت جمع مؤنث ہوگی

قائم ہو گئیں دل پہ برہ کی ساعتیں کڑیاں!

یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

استمرار کی صورت میں اصل فعل بھی جمع ہوا کرتا تھا جیسے عورتیں آتیاں تھیں اور گاتیاں تھیں۔ مولانا فرماتے ہیں یہ قاعدے زبان میں خوش آہنگی کا باعث تھے۔ اُردو نے انہیں ترک کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس کا جواب اوپر مذکور ہوا - زبان اپنے سرمایے کے اس حصے کو زندہ اور قائم رکھتی ہے جس سے کوئی فائدہ ہو۔ انگریزی، فارسی، بنگلہ وغیرہ بانوں میں مذکر و مؤنث دونوں کے لئے افعال و صفات یکساں ہوتی ہیں۔ ان زبانوں میں جنس کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ کوئی اسے ان زبانوں کا عیب نہیں سمجھتا اور یہ نہیں کہتا کہ "شخص مرد نیک و زن نیک یا (GOODMAN) اور (GOODWOMAN)" ناقص، "بدآہنگ" یا غیر حکیمانہ طرز بیان ہے۔ صفت و افعال میں جنس کے امتیاز کو ماہرین لسانیات اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور اسے اُردو زبان کی قدامت پرستی قرار دے کر کہتے ہیں کہ اس سے زبان کی شائستگی کو ضرر پہنچا جو اس تہذیب و ترقی کے عہد میں زبان کا جوہر ہے۔ مولانا صفت و موصوف اور مسند و مسند الیہ کی مکمل مطابقت برقرار رکھ کر زبان کو گراں بار بنانا اور کئی سو سال پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ پروفیسر یسپرسن نے مشہور لغوی میڈونگ کا حسب ذیل قول ایک مقام پر نقل کیا ہے[1]۔

---

[1] زبان میں ارتقا ص ۴۴ -

قدیمی تصریفی قاعدے ایک طرح کی لسانی عیاشی ہے ان قواعد کی رو سے ایک خیال جو اصلاً مسندالیہ سے وابستہ ہوتا ہے مسند کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں "ڈوبے گئے" "اس میں فعل گیا اس لئے جمع لایا گیا کہ اس میں تعدد تھا اور جانے والے متعدد بار گئے تھے؟"

اس اصول کے مطابق "عورتیں جاتیاں تھیں" میں "جاتیاں" صیغہ جمع مؤنث سے کیا ہم فعل جانا کی کثرت اور اس کی تانیث بتانا چاہتے ہیں۔

لفظوں میں کفایت شعاری موجودہ زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں کے پیشِ نظر کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کار زارِ حیات میں شریک ہیں حسب ذیل اُردو جملے کی:-

"مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی رہتی تھیں"

قدیم شکل مولانا یہ بتاتے ہیں:-

"مرنے والیاں لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں رہتیاں کہتیاں تھیاں"

ان دونوں جملوں کا مقابلہ کیجئے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ جملۂ اول میں جمع کا صیغہ تین بار استعمال ہوا ہے اور جملۂ ثانی میں آٹھ بار اور لطف یہ ہے کہ تزئین کلام کے سوا اس ناخوشگوار تکرار کا معنوی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ "مائیاں" مائی کی جمع ہے۔ ماں کی جمع مائیں ہے۔ "کی" کی جمع کیاں بعض دکنی میں ہوا کرتی تھی لیکن عام نہ تھی "معراج العاشقین" میں جہاں صندل کیاں لکڑیاں، رمزکیاں نشانیاں جیسی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں وہاں پیر کی صفتاں (ص ۲۰) معشوق کی باتاں (ص ۲۳) بھی ملی ہیں۔ جن میں مضاف جمع مؤنث ہے اس کے باوجود حرفِ اضافت کو مفرد لایا گیا ہے۔ شمالی ہند میں حرفِ اضافت کو جمع بنانے کا دستور نہ تھا۔ انشا لکھتے ہیں[1]:-

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۷۲۔

"کی' میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جو اضافتِ مؤنث کی علامت ہے"

روتیاں۔ کہتیاں کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ یہ اردو ہیں۔ ہر چند میر و سودا کے یہاں مؤنث افعال کی جمع 'اں' کے ساتھ استعمال ہوئی ہے اور اس کی چند مثالیں اوپر درج ہو چکی ہیں لیکن افعال میں جمع کا یہ قاعدہ اردو کے مزاج و منہاج کے خلاف ہے۔ اس کی سادگی پسند فطرت سے بعید نظر آتا ہے کہ اس نے کبھی 'اں' بڑھا کر فعل کی جمع بنائی ہو۔ اردو مؤنث افعال کی جمع 'ں' غنہ بڑھا کر بناتی رہی ہے اور اس کی متعدد مثالیں ہیں:۔

ہوئیں۔ گئیں۔ تھیں۔ آئیں۔ جاتیں۔ وغیرہ

'اں' کا اضافہ اس نے پنجابی سے سیکھا۔ انشا کہتے ہیں[1]۔

"لگائیں کی جگہ لگائیاں اور تھیں کی جگہ تھیاں مغل پورے والوں کی زبان ہے"

اس کے بعد یہ دیکھ کر کہ اس کے پاس پہلے سے ایک مختصر اور سادہ تر لاحقہ 'ں' موجود ہے اس کے ہوتے 'اں' کو اپنانا زبان میں بے ربطی پیدا کرتا ہے اس نے 'اں' کو ترک کر دیا اور بدستور 'ں' غنہ کے اضافے سے افعال کی جمع بناتی رہی۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اردو میں قواعدی ارتقا کا رجحان سادگی اور تخفیف کی طرف ہے۔ جہاں تک ہو سکا اس نے قدیم پیچیدہ صیغوں کو سادہ بنایا، گھٹایا اور کم کیا۔ اردو کے قدیم تر دور میں مفرد اور جمع دونوں میں جنس کا امتیاز تھا۔ آج یہ امتیاز صرف ان کلمات میں ہے جو الف پر ختم ہوتے ہیں۔ جن اسمائے کے آخر میں الف نہیں ان کے صیغے مذکر و مونث کے لئے یکساں ہیں۔ جیسے ہے (وہ مرد ہے۔ وہ عورت ہے) ہیں (وہ مرد ہیں۔ وہ عورتیں ہیں) جن کے آخر میں الف ہے ان میں بھی بعض صیغے ایسے ہیں جن میں بصورت تانیث مفرد اور جمع دونوں کے لئے ایک صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے۔

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۵ ۔

	(مفرد)	(جمع)
مذکر —	ہے گا	ہیں گے
مؤنث —	ہے گی	ہیں گی (دونوں کیلئے "گی")

یہی حال "آتی تھیں" "آتی تھیں" وغیرہ کا ہے۔ ان میں مفرد اور جمع دونوں کے لئے "آتی" اور "آتی" مفرد افعال استعمال ہوتے ہیں۔ انشا کا بیان ہے کہ دہلی میں "مغل پورے والے" جن کی زبان لاہور کے روزمرہ اور پنجاب کے روزمرہ سے گڈمڈ ہے "ہیں گی" کو "ہیں گیاں" کہتے ہیں[1]۔

اردو کی سادگی پسند طبیعت کی وضاحت ایک اور قاعدے سے بھی ہوتی ہے جو کبھی اردو میں بہت عام تھا۔ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے حرفِ علت پر ختم ہونے والے افعال کے آخر میں تعمیری لاحقہ اضافہ کرتے وقت ایک ہمزہ (یائے) بڑھا دیا جاتا تھا۔ اور "جاتا ہے" "فرماتا ہے" کو "جاتا ہے"۔ "فرماتا ہے" کہتے تھے[2]۔ اور ڈھاکر کو ڈھائے کر۔

دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

اسی طرح "لائے کر" "بیٹھائے کر" وغیرہ۔ آج یہ ہمزہ اس وقت بڑھایا جاتا ہے جب لاحقے کے شروع میں کوئی حرفِ علت ہو۔ دوسری صورتوں میں اس کا اضافہ نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو۔

ہوئی (ہو + ء + ی) جائے (جا + ء + ے) پیئے (پی + ء + ے)[3]۔
لائے (لا + ء + ے) نہلاؤ (نہلا + ء + و) گھٹائیں (گھٹا + ء + یں)

---

[1] - ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۴۴
[2] - ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۷ و ۱۹۷
[3] - اصل میں "پیے" تھا۔ مادے کی "ی" بعد میں تخفیف کی نذر ہوئی۔

اب لاحقوں کی کثرت استعمال کے تدریج کو لیجئے جیسپرسن کے حوالے سے اوپر عرض کیا چکا ہے کہ زبان جب ارتقا کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو پہلے تعمیری الفاظ پر ہاتھ صاف کرتی ہے جہاں کسی لفظ کی تعمیر میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ شریک ہوئے اس نقصان کو چھانٹ دیا جو زیادہ طویل تھے، جن کی ساخت میں الجھاؤ تھا، یا جو باہر سے زبان میں در آمد کر لئے گئے تھے اور اس کے مزاج کو سازگار نہ تھے، یا جن کی معنویت اور افادیت ختم ہو چکی تھی۔ زبان یہ کام اندھا دھند آنکھ بند کر کے انجام نہیں دیتی۔ ایک فطری اصول اس کے سامنے ہے جس پر وہ عمل کرتی ہے جو لفظ یا لاحقہ لفظی یا معنوی اعتبار سے کارآمد اور زندہ رہنے کے قابل ہوتا ہے، باقی رہ جاتا ہے اور جس میں صلاحیت نہیں ہوتی چھٹ جاتا ہے یا چھانٹ دیا جاتا ہے۔ زبان میں بھی بقائے اصلح کا اصول کارفرما رہا ہے۔

اردو میں مجروری حالت کے لئے میر و میرزا کے عہد تک "سے" کے ساتھ اس کی مندرجہ ذیل شکلیں مستعمل تھیں جن کا ذکر انشا نے کیا ہے۔

(۱) سیں (بیائے مجہول) سیں (بیائے معروف) ہندو بولتے تھے۔

(۲) سوں۔ سادات بارہہ کی اولاد کی زبان تھی۔

(۳) سِتی (س مکسور، ی معروف) سیتی (یائے اول مجہول) قدمائے اردو کی زبان پر تھا۔

دکنی اردو میں "سے" کی مندرجہ بالا اشکال کے ساتھ ذیل کے لاحقے بھی تھے۔

(۱) "تے" معراج العاشقین کا ایک جملہ ہے:۔

اگر اس میں سنے یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔

(۲) "تھے" محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے:۔

معانی کی باتاں تھے مجھ ترتا نمک

ان لاحقوں کے آخر میں "ن" غنہ اضافہ کر کے "تے" کو "تیں" اور "تھے" کو "تھیں" کہا

جاتا تھا۔ اُردو نے ان الحقوق کو چھانٹ دیا اور ان میں سے صرف 'نے' کو برقرار رکھا جو ان میں سب سے زیادہ ہلکا پھلکا مختصر سہل التلفظ تھا اور جس پر باہر کی زبان کی چھاپ نہ تھی۔

ظرفی 'میں' کی یہ کیفیت تھی کہ منے، موں، ماں، ماھ، ماھی اس کے شریک حال بنے ہوئے تھے اور سایہ کی طرح اس کے ساتھ تھے۔ اندر' بھیتر' اور 'بیچ' کا چلن بھی تھا۔ چمن کے بیچ یا چمن کے بھیتر۔ اُردو نے ان میں سے 'میں' کو منتخب کیا۔

'پر' ہر چند بڑے انقلابات کے بعد 'اوپر' سے ڈھلا تھا۔ لیکن 'اوپر' اس سے چھٹا ہوا تھا۔ اہل اردو کہا کرتے تھے "میں گھوڑے کے اوپر چڑھتا ہوں"۔ انشا لکھتے ہیں[1]:۔ "بعض فصحاء اس پر الف اور واؤ معروف بڑھا کر اوپر بولتے ہیں۔ ان کی گردن پر فصاحت کا خون ثابت ہے"۔

تک، لوں، تئیں[2]۔ توڑی، تاگر وغیرہ الفاظ 'تک' کی جگہ لیے ہوئے تھے۔ اردو نے ان میں سے 'تک' کا انتخاب کیا۔

ضمائر میں 'وہ' کے مقام پر 'سو' استعمال ہوا کرتا تھا۔ بارہویں صدی کے لگ بھگ اس نے حرف جزا کی جگہ لی۔ جیسے جو ہوا سو (وہ) ہوا۔ 'اس' کا ہم معنی 'تس' میر و مرزا کے عہد تک تھا۔

حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا ۔۔۔ منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
سو ابرو کھیاں ہیں تری بے وفائیاں ۔۔۔ تس پر بھی نت غرور ہے دل میں گناہ کا

'تس' چھوٹ گیا۔ اس کے ہوتے 'تس' کی کیا ضرورت تھی۔ سو (اور اس کا ہم معنی تو)

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۲۹۔
[2] میر درد کا شعر ہے:۔

پرورش غم کے تئیں یاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

آج بھی زندہ اور سلامت ہے۔

'تو' ضمیر واحد حاضر کی ایک شکل 'تیں' غالباً 'میں' کو دیکھ کر اور اس کے قیاس پر وضع ہوئی تھی۔ 'تو' فاعلی حالت تھی اور 'تیں' آلی (کبھی 'نے' کے ساتھ اور کبھی 'نے' کے بغیر) میر صاحب فرماتے ہیں:۔

ہوتا تھا مجلس آرا گر غیر کا تو مجھ کو ‌ ‌ ‌ ‌ مانندِ شمعِ مجلس کاہے کو تیں جلایا

تیں جلایا۔ تیں نے جلایا۔

فغاں کا شعر ہے:۔

کھا پیچ و تاب مجکو ڈسیں اب وہ کالیاں ‌ ‌ ‌ ‌ ظالم اسی لئے تیں نے زلفیں تھی پالیاں

'تو' نے 'تیں' کو نکال باہر کیا۔ 'تو' اب عام ہے۔ فاعلی اور آلی دونوں حالتوں میں استعمال ہوتا ہے 'وہ' کی جمع 'وے' میر کے یہاں ہے۔

حیف وے جن کنے اس وقت نہ پہنچا جس وقت

ان کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

سودا نے بھی اسے استعمال کیا ہے:۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

میر و سودا کے بعد بھی 'وے' مستعمل رہا۔ اب متروک ہے اور 'وہ' (مفرد) اس کی جانشینی کر رہا ہے۔ انشاء فرماتے ہیں[1]:۔

"فصحاء کے نزدیک ضمائر کی میزان ۲۵ ہے۔ غیر فصیح ۲۶ بتاتے ہیں کیوں کہ یہ ضمیر متصل غائب فاعل کے لئے جمع میں 'وے' قرار دیتے ہیں۔"

یسپرسن نے ایک مقام پر انگریزی ضمائر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے 'کچھ غیر آریائی اور غیر سامی زبانیں ایسی ہیں جو غائب کی ضمیروں میں بھی تذکیر و تانیث کا فرق

---

[1] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۰۵۔

نہیں کرتیں (اسی طرح HE اور SHE) دونوں کے لئے ایک ضمیر استعمال کرتی ہیں۔ یسپرسن نے اسے ان زبانوں کی شستگی اور شایستگی قرار دیا ہے۔ اس معیار سے دیکھیں تو اردو شایستگی میں ایک قدم آگے ہے کہ وہ غائب کی ضمیر میں جنس کے ساتھ ساتھ عدد کا فرق بھی روا نہیں رکھتی۔ مذکر و مونث واحد و جمع سب کے لئے 'وہ' استعمال کرتی ہے۔ قدیم زمانے میں 'وہ' واحد مذکر کی ضمیر تھی اور اس میں خصوصیت اور تعیین پائی جاتی تھی۔ آج عام اور غیر متعین ہے کہ مذکر و مونث واحد و جمع سب کے لئے ہے۔ ممکن ہے کوئی اسے زبان کا عیب سمجھے لیکن اہل علم کہتے ہیں کہ لفظ کی مفہوم کے لحاظ سے عمومیت لفظ کا وہ جوہر ہے جو اس میں اور خیال میں مطابقت یا ہم آہنگی پیدا کرتا ہے

مجھے۔ تجھے۔ ہمیں۔ تمہیں تالیفی ضمیریں ہیں اور مجھ کو، تجھ کو، ہم کو، تم کو تحلیلی۔ یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ تحلیلی ضمیروں کی موجودگی میں تالیفی ضمیریں کیسے زندہ رہیں؟ چھٹ کیوں نہ گئیں؟ سادگی، اختصار اور سہولت کا اصول ان میں کیوں نہ برتا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تالیفی ضمیریں (جیسا کہ اردو زبان کے ارتقا میں عرض کر چکا ہوں) اصلاً مفعولی (ثانوی) ضمیریں ہیں۔ مفعول اول اور ثانی میں بظاہر کوئی فرق نہ تھا اس لئے وہ مفعول اول کے لئے استعمال ہوتی رہیں۔ ان کے اختصار نے ان کو زندہ رکھا۔ اب آہستہ آہستہ یہ تحلیلی ضمیروں کی جگہ لے رہی ہیں۔ اگر ان کے دستبرد کی یہی کیفیت رہی تو وہ دن دور نہیں کہ تحلیلی ضمیریں زبان کے عمل سے بے دخل ہو جائیں اور یہ ان کی جگہ لے لیں۔

'کیا چاہیے'، 'پڑھا چاہیے'، 'کرنا چاہیے'، 'پڑھنا چاہیے'، دونوں طرح لوگ بولتے تھے۔ اور شاید لکھتے بھی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ "کیا چاہیے" فصیح تھا اور کرنا چاہیے، بقول انشا اہل کشمیر کی زبان تھی جو دہلی میں آ کر بس گئے تھے۔ انیسویں صدی کے ربع سوم تک "کیا چاہیے" کا عمل رہا۔ میر مہدی مجروح ایک خط میں لکھتے ہیں "ان سے کہا چاہیے کہ ارے بندۂ خدا اسے ڈر" اس کے بعد 'کہنا چاہیے' فصیح سمجھا جانے لگا

عوام کے دربار سے اسے سند ملی۔ آج وہ مستند ہے اور کہا جاتا ہے "مترد ہو چکا ہے"۔ اس سے بھی زبان کی انتخابی فطرت روشنی میں آتی ہے۔

صرفی تغیرات کے مقابلے میں زبان کے نحوی قاعدوں میں تغیر کم ہوا لیکن جتنا کچھ ہوا تحریر کی زبان تک محدود رہا۔ ۱۸۰۰ء تک فعل و فاعل میں کوئی خاص ترتیب نہ تھی۔ انشا نے دریائے لطافت میں فعل و فاعل کے استعمال کی جو مثالیں درج کی ہیں ان میں فعل کہیں مقدم ہے اور کہیں موخر۔ جیسے آوے گا تو۔ یا تو آوے گا۔ آوگے تم۔ یا تم آوگے ۱۸۵۰ء کے قریب غالباً فارسی نحو کے زیر اثر فعل کی فاعل پر تقدیم اُردو روزمرہ کے خلاف سمجھی گئی[1] آج اردو کا مقررہ نحوی قاعدہ یہ ہے کہ فاعل فعل سے پہلے ہو۔ پہلے مضاف، مضاف الیہ پر مقدم ہوا کرتا تھا' یہ عربی و فارسی کا اثر تھا اور اردو کی اصل قدیم پراکرت کے مزاج کے خلاف تھا۔ سرسید کے عہد میں اس کی اصلاح ہوئی اور ماسوا' سوا بجز وغیرہ چند الفاظ کو چھوڑ کر اردو کا قاعدہ یہ ہوا کہ مضاف الیہ مضاف سے پہلے لایا جائے۔

انشا کے زمانے میں حروفِ مغیرہ کا اثر معطوف تک محدود تھا معطوف علیہ پر اس کا اثر نہ ہوتا تھا۔ مثلاً "تین رنڈیاں اور دو ڈومنیوں کا مجرا ہوا" یا "تین رنڈیاں اور دو ڈومنیوں کو زید نے اشرفیاں دیں"۔ انشا یہ مثالیں لکھنے کے بعد فرماتے ہیں[2]۔

"بعضوں کے نزدیک موافقت لازمی ہے۔ جیسے تین رنڈیوں اور دو ڈومنیوں کا مجرا ہوا لیکن عدم موافقت فصیح ہے"۔

انشا کے فتوے پر آج کوئی عمل نہیں کرتا۔ آج موافقت فصیح ہی نہیں صحیح بھی ہے' اور عدم موافقت از روئے قواعد زبان غلط اور نا صحیح ہے۔

---

[1] گریرسن کا خیال ہے کہ ہندی میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آرہا ہے کہ فاعل فعل پر مقدم ہو۔ مجھے اس کی صحت میں شبہ ہے کسی مناسب موقع پر تفصیل سے عرض کروں گا۔

[2] ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۹-۳۲۔

(۸)

مِزاج و منہاج

انسان کی طرح زبان بھی ایک مزاج اور طبیعت کا انداز رکھتی ہے جسے میں منہاج کہتا ہوں۔ مزاج زبان کی اندرونی چھاپ ہے۔ صرفی، نحوی، صوتی خصوصیات جن سے زبان کی تعمیر ہوتی ہے زبان کا رجحان اور ظاہری آب و رنگ اس کا منہاج ہے۔ اردو کی علم ادبی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بیمز، اسمتھ، سکسینہ وغیرہ اہل علم نے لکھا ہے[1] کہ اردو فصیح و بلیغ، شیریں زبان، واضح بیان، شائستہ اور ترقی پسند زبان ہے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اردو کی (فصاحت و بلاغت) شیریں زبانی وطلاقت لسانی کا راز کیا ہے، وہ کون سی صرفی نحوی خصوصیات ہیں جو اردو کے لئے باعثِ امتیاز ہیں آخر کس روشِ خاص پر اردو کو ناز ہے۔

یہ کسی قدر دشوار ہے کہ اردو کے مزاج کو کسی ایک لفظ میں بیان کر دیا جائے۔ انسان کا مزاج پیچیدہ ہونے کے باوجود سادہ تھا کہ یونانی اطباء اسے صرف دو لفظوں میں (حار، یابس۔ رطب، بارد) بیان کر گئے۔ زبان کا مزاج انسانی مزاج سے

---

[1] جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۶۶ء صفحہ ۱، تاریخ ہندوستان جلد ۲، تاریخ ادب اردو باب ۱۹

شاید کچھ زیادہ پیچیدہ ہے۔ اسے دو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں سہل انگاری سے کام لیں اور منطقی نزاکتوں کو نظر انداز کر دیں تو مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر چیٹرجی کی ہمنوائی میں کہہ سکتے ہیں کہ اردو "مردانی زبان ہے، پکے کی بولی ہے"۱۔ چیٹرجی نے مردانی زبان کی وضاحت نہیں کی اور یہ نہیں بتایا کہ مردانی زبان کن صفات کی حامل ہوا کرتی ہے۔ میڈلٹن مری مردانہ اسلوب بیان کا ذکر کرتا ہے۔ فرانس کے ادب یک جنسے احادی التقطیع قافیوں کو مردانہ اور دو جنسے دوہرے قافیوں کو، جن میں پہلا ضعیف ہو اور دوسرا قوی، زنانہ کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان و ادب کی کچھ خصوصیات انسان کی مردانہ صفات کے مطابق ہیں۔ یسپرسن نے ان صفات کا، جن میں سے کچھ صوتی اور صرفی ہیں اور کچھ لغوی اور نحوی، تفصیل سے ذکر کیا ہے۲۔ آیئے دیکھیں اردو کس حد تک ان صفات کی مالک ہے۔

سب سے پہلے اردو کے صوتی نظام کو لیجئے! حروف صحیح اردو میں واضح، نمایاں اور جلی التلفظ ہیں۔ "ت" "ٹ" ہے اور "د" "ڈ"۔ اہل اردو ان حروف کا تلفظ کچھ ایسے جلی انداز میں کرتے ہیں کہ ان میں کسی قسم کا خلط و اشتباہ نہیں ہوتا۔ ہر حرف دوسرے سے ممتاز اور صاف صاف ادا ہوتا ہے اور گرد و پیش کے کسی حرف یا حرکت کی وجہ سے دبنے نہیں پاتا۔ "ر" عام طور سے حرف صحیح کی صحبت میں دب جاتی ہے لیکن اردو والے "مرد" کا تلفظ کرتے ہیں تو "ر" صاف سنی جاتی ہے۔ "مرت بیائی" (وہ عورت جس کی اولاد زندہ رہے) خاص عورتوں کا لفظ ہے جسے وہ اس طرح ادا کرتی ہیں کہ "ر" ابھری رہتی ہے۔ بھرتا، کرتا، وغیرہ الفاظ کا بھی یہی حال ہے۔

اردو (ڑ) اور ہائیہ حروف (کھ) گھ، بھ، وغیرہ کا تلفظ جیسا کہ چیٹرجی نے

---

۱ انڈو آرین اور ہندی ص ۱۳۸ -

۲ "انگریزی زبان کا نشو و نما اور اس کی ساخت" باب اول "تمہیدی خاکہ"

لکھا ہے[1]، صحیح اور درست طریقے سے کرتی ہے۔ بنگلا کی طرح نہ اس کا طرزِ ادا ضعیف ہے اور نہ پنجابی اور گجراتی کی طرح مجہول اور گھٹا گھٹا۔ قدیم زمانے میں شمال جنوب اور مشرق و مغرب کی زبانیں 'س' کے تلفظ پر قادر نہ تھیں۔ شمال مغرب میں اسے 'ہ' سے بدل لیا گیا اور مشرق میں 'ش' سے لیکن اردو کے علاقہ مدھیہ دیش میں 'س' کا صحیح تلفظ ہوا۔ بنگلا آج بھی 'س' کو 'ش' ہی کہتی ہے۔ 'ڑ' اور 'ل' میں اردو امتیاز کرتی ہے جب کہ بہاری بولیوں میں 'ل' 'ڑ' کا قائم مقام ہے جہاں 'گلی' کو 'گاڑی' کہا جاتا ہے اور ڈھیل کو پھر پنجابی 'ٹ' کو ٹھیک ٹھیک ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے 'ڈ' سے بدل لیتی ہے۔ بنگلا میں 'ج' 'ز' ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس 'ز' 'ج'۔ جنوبی ہند میں 'ق' کو 'خ' کہتے ہیں اور وہی 'ق' پنجاب میں 'ک' ہو جاتا ہے۔

سنانی (ت۔د) اور ملفوظی (ٹ۔ڈ) میں اردو نے امتیاز رکھا۔ آسامی اور بول چال کی گجراتی نے ان میں گڈمڈ کر کے نئے قسم کے لثوی حروف ALVEOLAR وضع کر لیے[2]۔

حرکات و علل اردو میں سادہ ہی نہیں ان کی مقدار بھی متعین ہے۔ زیر، زبر، پیش تین حرکتیں ہیں جن کی تین طویل صورتیں ہیں۔ یہ علل (مد) کہلاتی ہیں ('ا' اور 'و' 'ی' معروف) چار مرکب علتیں ہیں۔ زبر اور 'ے' (مجہول) جیسے 'میں' (ضمیر متکلم) زیر اور 'ے' (مجہول) جیسے 'میں' (درمیان) زبر اور 'و' (مجہول) جیسے 'اور' (حرف عطف) پیش اور 'و' (مجہول) جیسے 'اُور' (طرف) بنگلا اور کشمیری کی طرح ان حرکات میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ مرہٹی اور بنگالی میں ان کے علاوہ کچھ اور پیچیدہ حرکتیں بھی ہیں جو حرکتوں

---

[1] "انڈو آرین اور ہندی" ص ۱۲۹۔

[2] انگریزی لفظ REFLEXIVE کا ترجمہ ڈاکٹر ندوی نے 'کوزی' فرمایا ہے۔ میں لثوی مناسب سمجھتا ہوں۔ ان حروف کو ادا کرتے وقت زبان کسی قدر پلٹ جاتی ہے۔

کی مقدار کا اردو خاص طور پر خیال رکھتی ہے۔ حرکت کو اسی قدر کھینچتی ہے جتنا کھینچنا چاہیے۔ آسامی، بنگلہ اور پنجابی میں بڑی افراتفری ہے۔ آسامی 'پ'، 'د'، 'ی' اور 'ے'، 'ے' 'و' میں کوئی فرق نہیں کرتی[1]۔ بنگلہ دو حرفی کے فتحے کو اتنا کھینچتی ہے کہ 'الف' ہو جاتا ہے۔ طویل کو قصیر اور قصیر کو طویل کر دینا بنگلہ کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ چنانچہ بنگلہ میں 'بہار'، 'باھار' اور 'باہر' میں کوئی فرق نہیں۔ پنجابی لفظ کی دوسری علت (ا، و، ی)، کو تلفظ میں دبا دیتی ہے۔ اہلِ پنجاب بے عزتی کو بزتی، تاکید کو تکید، لاہور کو لہور، معلوم کو (جس کا عوامی تلفظ ملوم ہے) ملوم بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہار اور بنگال کے علاقوں میں ابتدائی 'ی' اور 'و' کا تلفظ نہیں ہوتا۔ انشا نے لکھا ہے:۔

"وہ فارسی کو اس لہجے سے ادا کرتے ہیں کہ اہلِ ولایت کو ان کی زبان اور لہجے کی صحت سے دھوکا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی عربی سے عرب والوں کو دھوکا ہوتا ہے[2]۔"

مراد یہ ہے کہ اہلِ اردو کا لہجہ، تلفظ اور طرزِ ادا اتنا واضح اور صاف ہے کہ اہلِ زبان تک اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

بنگلہ، سندھی، اودھی، برج، آسامی، جدید ہندی وغیرہ زبانوں کے اکثر اسماء و صفات متحرک الآخر ہیں۔ اردو میں یہ متحرک الآخر کلمے حروفِ صحیح پر ختم ہوتے ہیں اس نوع کے کلمات کی اردو میں بڑی ریل پیل ہے جیسے آج، کل، بات، رات، ساتھ، ہاتھ، دل، جگہ، کھانڈ۔ یہ اردو کا مزاج ہی ہے۔ آخر کلمے میں دو حروفِ صحیح کا اجتماع (ایک جنس کے ہوں یا دو جنس کے) اردو پسند نہیں کرتی۔ مرد، شرم، گرم، نرم وغیرہ دو حروفِ صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ اردو میں دخیل ہیں جو فارسی سے در آمد ہوئے جب تک یہ الفاظ

۱۔ "آسامی: اس کی تعمیر اور ارتقا" ص ۴۶
۲۔ ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۵۱

اوپر کے طبقے میں رائج رہے ان کا مخلوط تلفظ کسی نہ کسی حد تک برقرار رہا۔ عوام میں پہنچتے ہی انہیں اردو مزاج کے مطابق ڈھال لیا گیا اور ماقبلِ آخر حرف کو متحرک کر کے مرد کو مرد، شرم کو شرم، گرم کو گرم، نرم کو نرم، بولا جانے لگا۔ مست، گوشت، پوست، قبض آج بھی مخلوط ہیں۔ گوشت اور پوست کو 'و' نے جس کی وجہ سے مخلوط حروف کی کرختگی کسی نہ کسی حد تک کم ہو گئی تھی، برقرار رکھا۔ مست، مستا اور قبض' ان پڑھ لوگوں میں قبض (بفتحہ ب) ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کے ایسے الفاظ جو دو حروفِ صحیح پر منتہی ہوتے تمام تر وہ ہیں جن کا ایک جزو 'ن' ہے۔ اور وہ بھی گنے چنے ہیں[1]۔

ونڈ (ورزش یا تاوان) ونڑ (ورزش) جھنڈ۔ کنڈ۔ گنڈ منڈ۔

اک بے نوا کے لڑکے پہ مرتے ہیں شیخ جی — عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

(انشاؔ)

ان الفاظ کے باقی رہ جانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ 'ن' تلفظ میں اتنا ہلکا تھا کہ حرفِ صحیح کے ساتھ مخلوط ہو کر بھی اس میں کرختگی پیدا نہ ہو سکی۔

پنجابی میں دو حرفِ صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ کی بھرمار ہے۔ ایک حرفِ صحیح پر کلمے کا اختتام مردانہ پن ہے اور دو حروفِ صحیح پر اختتام کرختگی۔ اردو میں مردانہ پن ہے کرختگی نہیں۔

اردو کلمات حرفِ صحیح پر ختم نہ ہوں تو حرفِ علت پر ختم ہوں گے جیسے بھلا، بنگلا، بھال، کتنا، دیکھا، گت، کالا، دیکھا کال، گاڑھا (بیگمہ گاڑھ) اردو اسماء و صفات کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جن کے آخر میں حرفِ صحیح ساکن ہو۔

(۲) جن کے آخر میں حرفِ علت (و، ی) ہو یا (مغنونہ ن، م)، بنگلا، بندی،

---

[1] اردو نے اپنے مزاج کے مطابق اس قسم کے تمام الفاظ 'ن' ختم کر کے اور ماقبل حرکت کو کھینچ کر سہل اور خفیف التلفظ بنا لئے ہیں۔ جیسے کھنڈ، سونڈ، لبنڈ، چاند۔

سندھی وغیرہ میں، جیسا کہ عرض کیا گیا، حرکات یعنی زبر، زیر اور پیش، پر ختم ہونے والے کلمات بھی ہیں اور ان کی خاصی تعداد ہے۔ اردو میں اس قسم کے کلمات نہ ہونے کی وجہ اس کا مخصوص اندازِ وقف ہے۔ بنگلا وغیرہ زبانوں میں وقف لفظ کے اولین جزو پر ہوتا ہے۔ اردو میں آخری جزو پر۔ آخری جزو پر دباؤ پڑ جانے کے باعث حرف کی آخری حرکت کھنچ جاتی ہے اور جو کلمہ پہلے یک جزا تھا دو جزا ہو جاتا ہے جس کا آخری جزو سخت اور قوی ہوتا ہے۔ یہ سختی بڑی حد تک زبان کی مردانہ قوت اور بجا بھر کم پن کی دلیل ہے:

اردو مرکبات و مشتقات کا مقررہ قاعدہ ہے کہ ترکیب کے بعد مرکب کے جزو اول کو کاٹ کر مختصر کر دیا جاتا ہے گویا کاٹ تراش کا عمل ضرور سے حرفِ علت پر جاری ہوتا ہے جیسے پنہارا (پانی ہارا)، پستہاری (پسان ہاری)، گھسیارا (گھاس یارا)، ترچھا سوا (تیرچھا سوا) تھڑدلا (تھوڑا دلا) اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ کلمے کے آخر میں لاحقہ اضافہ ہوا تو وقف کا زور دوسرے جزو پر جا پڑا اور پہلا جزو کمزور ہو کر ترش گیا۔

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ یک جزے کلمے قوی التلفظ بھی ہوں لیکن پیرسن کا خیال ہے کہ دو جزے کلمات سے جن کا آخری جزو ضعیف ہو کسی قدر بڑھا ہوا یک جزے الفاظ زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اردو یقیناً قوی زبان ہے۔ اس میں یک جزے الفاظ بہت ہیں۔ اردو کے قریب قریب تمام معاون افعال یک جزے ہیں۔ جیسے ہے (جو پہلے 'اہے' تھا)، تھا (قدیم 'اتھا') گا۔ 'ہے' سندھی میں آج بھی دو جزا ('آہے') ہے۔ حروف ظرفیت 'جب'، 'تب' (پنجابی جداں، تداں) (اب بنگلا اکھن) ایک جزے ہیں۔ تو، میں، تم، ہم، وہ، ضمیریں یک جزی ہیں۔ ان کے مقابلے میں تسی، اسی، آمی، آمرا، تومرا پنجابی اور بنگلا ضمیریں دو جزی ہیں۔ نے، سے، پر، میں، تک، کا، کو وغیرہ اعرابی لاحقے یک جزے ہیں۔ الفاظ دوسرے الفاظ کے

مقابلے میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں اس لئے اُردو زبان کی توانائی اس کی ہمسر زبانوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یسپرسن نے اداۃ تعریف (THE) کے عدم استعمال کو بھی زبان کی توانائی کا ایک عنصر قرار دیا ہے۔ اردو قوی تر زبان ہے کہ اس میں سرے سے آلہ تعریف ہی نہیں۔

اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ اردو کو دو حرکات کا اجتماع[1] (HIATUS) سخت ناگوار ہے اس کا تعلق اس مسئلے سے ہے جو اس وقت زیر بحث ہے۔ اجتماعِ حرکات کی صورت میں تلفظ کی توانائی قائم نہیں رہتی اور لفظ دو یا دو سے زیادہ ضعیف التلفظ حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ اردو نے ان حرکات کو ملا کر دو جزے لفظ کو یک جزا اور سہ جزے کو دو جزا بنا لیا۔ ذیل کی مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

آار (مشرقی ہندی) دو جزا تھا۔ اُردو نے اس سے اور یک جزا لفظ ڈھالا۔ رکھے آو (پنجابی و ہریانی) اُردو: رکھا۔ کئس (مشرقی ہندی) کیسا (اُردو) مارے آر (پنجابی) مارا (اُردو)۔ ذیل کے الفاظ میں دو حرکتوں کا اجتماع اُردو نے گوارا کر لیا کہ لفظ کے دونوں مقاطع (جز) قوی تھے۔

جائی۔ نائی۔ سائی۔ ناؤ۔ کھاؤ۔ جائے۔ لائے۔ کھائے۔ ذیل کے الفاظ کا مقطعِ اول ہر چند ضعیف ہے لیکن ان میں اگر حرکات و علل کا ملاپ ہو جائے تو 'لئے' اور 'لے'۔ دیئے اور دے۔ کئی اور 'کے' کے درمیان کوئی فرق نہ رہے۔

گئے سے۔ بچے۔ ہوئے۔ بھائی وغیرہ کلمات اصلاً طویل المقاطع ہیں (گی ئے سی ئے۔ بی ئے۔ ہو ئے۔ ہو ای) شاید اس لئے برداشت کر لئے گئے۔ بہر حال دو حرکات کی یک جائی اردو کے مزاج کو سازگار نہیں۔

اس کے علاوہ یسپرسن کا بیان ہے، جسے میں بڑی حد تک صحیح سمجھتا ہوں کہ

---

[1] دو متعاقب مقاطع جزاؤں میں حرکتوں کا اجتماع گرامر کی اصطلاح میں (HIATUS) کہلاتا ہے

بات کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرنا مردانہ طرزِ بیان کا خاصہ ہے۔ مرد عام طور سے اختصار پسند کرتے ہیں۔ عورتیں باتونی ہوتی ہیں۔ ہر بات کو گھما پھرا کر کہنا اور بات میں سے بات پیدا کرنا عورت کی فطرت ہے۔ کسی زبان کا اندرونی اختصار اس کے مردانہ پن کی علامت ہے۔ اُردو صرف و نحو کے لحاظ سے مختصر ترین زبان ہے۔ چڑجی کہتے ہیں اُردو گرامر کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ گریرسن کی مشہور کتاب "ہندوستان کا لسانی جائزہ" کا ایک صفحہ اس کے لئے کفایت کر گیا جب کہ مصنف کو اودھی، بنگالی، مرہٹی، تامل، تیلگو کے لئے پورے دو صفحے وقف کرنے پڑے۔ مشرقی پنجابی کے قواعد تین صفحات میں سمائے اور میتھلی کے چار صفحات میں۔ یہ مستند اور معیاری اردو کا ذکر تھا روزانہ بول چال کی بازاری اردو کے قاعدے اس سے کہیں زیادہ مختصر ہیں جنہیں چڑجی کی رائے میں "زیادہ سے زیادہ ایک معمولی پوسٹ کارڈ پر لکھا جا سکتا ہے"[1]۔

اُردو صرف و نحو آج ان تمام غیر ضروری پیچیدگیوں سے پاک ہے جو کبھی اردو کے قدیم ترین دور میں اس سے چپکی ہوئی تھیں اور اس کی بعض ہمسر بولیوں میں آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ میں پیچھے کر چکا ہوں۔ اردو نے وہ تمام اعرابی لاحقے جنہیں تراشا جا سکتا تھا کانٹ چھانٹ کر مختصر کر دیئے "آتی تھیں" کبھی اردو میں "آتیاں تھیں" تھا۔ جو پہلے "آتیں تھیں" ہوا اس کے بعد "آتی تھیں"۔ "گرمی گھڑیاں" اختصار ہے "کڑیاں گھڑیاں" کا۔ "لوگاں کہتے تھے" میر کے زمانے میں بولا جاتا تھا۔ یہی "ہیں"، "رہی ہیں" غالباً اٹھارہویں صدی کے ربع آخر تک "رہیں ہیں"۔ "رہیں ہیں" یا "تھا"۔ میرزا جان تپش کی ایک غزل "نہیں ہیں" کی ردیف میں ہے۔ اس میں ذیل کے مصرعے اس پرانی اردو کی یاد دلاتے ہیں۔

فرقت میں جن کی ہم نے یہ حالتیں سہیں ہیں

---

[1] انڈو آرین اور ہندی ص ۱۶۲۔

خونناب دل کی پھر تو جوئیں کئی بہیں ہیں

باتیں ابھی تو تم سے کہنی بہت پڑی ہیں

پنجابی کا مندرجہ ذیل جملہ ملاحظہ ہو۔

"اوہ دے وچ کتیاں ساریاں وڈیاں وڈیاں کوٹھریاں رنگ برنگیاں بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت دیاں۔"

اس میں جمعیت کا اظہار جدا جدا ہر لفظ سے کیا گیا ہے۔ یہی بات اردو میں کہیں تو تمام لاحقات جمع چھانٹ کر اس طرح کہیں گے "اس میں کتنی ساری بڑی بڑی رنگ برنگی کوٹھریاں ہیں بعض چاندی کی اور بعض یاقوت کی"۔ اس پورے جملے میں صرف ایک اسم "کوٹھری" جمع ہے۔ باقی اسماء وصفات پنجابی میں جمعیت کے حامل تھے۔ اردو میں مفرد ہیں۔ اس کے باوجود اردو جملے کا مفہوم واضح ہے۔ اس میں وہ لڑکھڑاہٹ نہیں جو ان کی لگاتار تکرار سے پنجابی جملے میں پیدا ہو گئی تھی۔

یسپرسن نے عنوان میں اختصار سے آگے بڑھ کر حذف و تقدیر کا ذکر بھی کیا ہے اور انگریزی کے ان جملوں کو جن میں خارجی قرائن پر اعتماد کر کے فعل حذف کر دیا گیا تھا بطور مثال پیش کر کے لکھا ہے کہ یہ ایک طرح کا نحوی اختصار ہے۔ اردو وضاحت کی قائل ہے۔ چبا چبا کر باتیں کرنا عورت کی فطرت ہے مرد کھلی اور روشن انداز میں بات کرتے ہیں۔ CAN کا ہم معنی اردو میں "سکنا" ہے۔ انگریزی میں CAN اصل فعل کے بغیر تنہا بھی استعمال ہوتا ہے[1]۔ اور شاید بنگلا پاری (میں سکتا ہوں) کا تنہا استعمال انگریزی محاورے ہی کا اثر ہے معیاری اردو میں فعل کے بغیر "سکتا" بولنا اور "میں نہیں کر سکا" کی بجائے

---

[1] فارسی محاورہ بھی یہی ہے "می توانم" (میں کر سکتا ہوں)

میں نہیں سکا" کہنا (جیسا کہ بنگال میں عام طور سے بولتے ہیں) درست نہیں۔ یہ نحوی اختصار نہیں کاروباری اختصار ہے۔ اُردو نحوی اختصار برتتی ہے[1]۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی (لاجواب بات کی) میں چاہتا تھا لیکن جا نہ سکا (جانا چاہتا تھا) تو میری کب سنے گا (میری بات) اس کے گھر کا ہوا (اس کے پہلو یا اس کے گھر) داڑھی میں لال بال تھے اس بدخصال کے (بدخصال کے وہاں)۔

اردو کے ارتقا کا زمانہ قریب قریب وہی ہے جو مسلمانوں کی سیاسی پستی اور اخلاقی انحطاط کا ہے۔ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی اردو شاعری کی زبان کھلی اردو اول اول شعر و سخن کی زبان قرار پائی اور ریختہ کہلائی اس کے بعد کہیں انیسویں صدی کے آخر میں سنجیدہ علمی، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی مضامین کی ترجمانی کا اسے منصب ملا۔

اردو میں بیک وقت دو صفات پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف وہ جذباتی زبان ہے، دوسری طرف غیر سنجیدہ چھچھورپن کی اس میں جھلک ہے۔ لیکن ان صفات کا تعلق اردو کی ساخت سے زیادہ لفظی سرمایہ اور بیان کے گوناگوں اسالیب سے ہے۔ اردو میں مبالغہ آمیز الفاظ و مرکبات کا شمار نہیں۔ حد کا۔ بے حد۔ بے حساب۔ بے نہایت۔ بدرجہ غایت۔ بے انتہا۔ جب کسی کی مدح یا قدح مقصود ہو تو اردو ان سے کم تر درجے کے الفاظ استعمال نہیں کرتی۔ وہ بلا کا ذہین ہے۔ حد کا کم ظرف۔

وہ حد کم ظرف ہیں جو ایک ساغر میں بہکتے ہیں

(آتش)

اس نے بے حد و حساب دیا۔ اس کی عنایات کا شمار نہیں کیا جا سکتا وغیرہ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس بیان سے اردو کی متانت کو صدمہ پہنچا لیکن میں عرض کر چکا

---

[1]۔ اختصار کی ایک تیسری قسم بیانی اختصار ہے۔ اسے ایجاز کہتے ہیں یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی زیادہ۔ جیسے "مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا" اگر یوں کہتے "مجھ کو پوچھا تو مہربانی کی" تو ایجاز نہ ہوتا۔

ہوں کہ یہ اردو کا قصور نہیں اس کا انداز بیان اس کا ذمہ دار ہے جو اس نے اپنے مربیوں کی آغوش میں سیکھا۔ اردو ایک آئینہ ہے جس میں اہل اردو کے قومی اخلاق کی جھلک نظر آتی ہے۔ جہاں تک زبان کی ساخت اور اس کے مزاج کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو نے لفظ و معنی میں ہم آہنگی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ لفظ میں کسی حرف یا لاحقہ کا اضافہ اردو نے اس وقت کیا جب کوئی نیا مفہوم پیدا کرنا مقصود تھا۔ ہماری بولیوں میں تقریباً ہر لفظ کی تین قسمیں ہیں۔ قصیر (گھوڑ) طویل (گھوڑا) طویل تر (گھوڑوا) معنی اور مفہوم کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں اردو میں زوائد کئے گئے (یا موٹے کے لئے) لاحقات تصغیر ہیں۔ مرد۔ مردوا۔ بھاڑو۔ بھڑوا۔ بوڑھا۔ بڑھوا۔ لوٹا۔ لٹیا موڑھا۔ مڑھیا۔ بچہ۔ بچوا۔ سالہ۔ رسلیا۔ یہ اردو کی شائستگی ہے کہ اس کا کوئی سابقہ یا لاحقہ بے مصرف نہیں جیسے تزئین جامہ کے لئے بڑھایا گیا ہو۔ پیٹو (پیٹ پیٹ والا) پیٹیں (بہت پیٹ والا، دو مدے ہوئے)۔ موٹو۔ موٹن۔ موٹلا۔ اس میں تین درجے ہیں۔ چھوٹا۔ چھٹکا۔ چھٹکن یا چھٹکنا۔

زبان منطق کا چربہ ہوتی ہے۔ انسان جس طرح سوچتا ہے اس کی کوشش کرتا ہے کہ ٹھیک اسی طرح اپنے خیالات کا اظہار کر دے تاکہ زبان و بیان (منطق) میں مطابقت رہے۔ یہ مطابقت دو قسم کی ہے۔ ظاہری یعنی قواعدی مطابقت جو دنیا کی زبانوں میں سے صرف چینی کو حاصل ہے۔ زبان پہلے ہے اور اس کے صرفی نحوی قاعدے بعد میں۔ بعض اہل علم زبان میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی الٹی گنگا بہاتے اور زبان کے قاعدوں کا زبان سے استنباط کرنے کے بجائے خود ساختہ قاعدوں کے مطابق زبان کو توڑتے مروڑتے ہیں[۱]۔ زبان کے لئے یہ کوئی اچھی فال نہیں۔ دوسری مطابقت معنوی ہے یعنی زبان کی تعبیرات کی اصول فکر سے ہم آہنگی۔ دوسرے الفاظ میں تو شاید ہی کوئی

۱؎ مثلاً بعض لوگ اس طرح بولتے سنے گئے ہیں جو ہم نے اہل زبان میں سے کسی سے نہیں دیکھا، یہ زبان کو قاعدے کے مطابق توڑنا مروڑنا نہیں تو کیا ہے۔

زبان منطق سے ہم آہنگ ہو لیکن یہ سب کہتے ہیں کہ زبان جس قدر انسانی فکر و خیال کی رسم و راہ اور اس کے پیچ و خم سے قریب ہو گی اسی قدر شائستہ اور مہذب سمجھی جائے گی۔ اردو بڑی حد تک اصول منطق کے مطابق ہے۔ اُردو کے افعال کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ گیا۔ وہ گیا ہے۔ وہ گیا تھا۔ منطقی فکر و خیال کے مطابق ہر فعل کا محل استعمال جدا ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

یہاں 'چاہا تھا' کی جگہ 'چاہا' اور 'نہ ہوا' کی جگہ 'نہ ہوا تھا' صحیح نہیں۔ 'چاہا' اور 'ہوا' ہر چند ماضی کے صیغے ہیں لیکن ان کا زمانہ مختلف ہے۔ 'چاہا' پہلے ہے اور 'ہوا' بعد میں۔

اردو میں استمرار کے تین صیغے ہیں جن میں نازک منطقی فرق ہے۔ 'پڑھتا تھا' کا مطلب ہے پڑھنا مدتوں جاری رہا۔ 'پڑھ رہا تھا' سے تسلسل اور استمرار کا اظہار ہوتا ہے۔ 'پڑھا کرتا تھا' یہ اس کی عادت تھی۔ 'پڑھ لیا، پڑھ دیا، پڑھ چکا' وغیرہ مرکب افعال اصول منطق کے مطابق وضع ہوئے جو خیالات کے نازک ترین فرق واقعیاتی کو پیش کرتے ہیں۔[1] امر کے تین صیغے ہیں 'پڑھو' اور 'کہو' کا انداز تحکمانہ ہے۔ 'جانا' اور 'کہنا' میں درخواست ہے 'جائیے' اور 'کہیے' میں التجا ہے۔ (لگاتار بلا انقطاع) 'پڑھے جاؤ' میں استمرار ہے (علی الدوام) 'پڑھتے رہو' اس میں مداومت ہے اور دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

کرنا، دینا، بنانا وغیرہ مصادر کی مدد سے وضع افعال کا طریقہ اردو میں عام ہے۔ چیزیں کہتے ہیں اس کا اردو میں اظہار و بیان کی نئی نئی راہیں کھلیں۔ صاف کرنا، بیوقوف بنانا، آواز دینا، کھوج لگانا۔ اردو میں اسم سے فعل بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسم کے آخر میں 'انا' بڑھا دیا جائے جیسے گرمانا، شرمانا، للچانا، سستانا، پچھتانا، ٹھنڈانا۔

۱۔ ملاحظہ فرمائیے "وسیلۂ لطافت" ص ۹۹، ۹۸۔

(ٹھنڈا) کا الف 'ی' سے بدل گیا تاکہ لاحقہ کے الف سے امتیاز رہے) لیکن یہ عام نہیں صاف سے 'صفیانہ' اور سیاہ سے 'سیاہنا' نہیں کہتے۔ برقانا (برق سے)، قلمانا (قلم سے) نئے الفاظ ہیں۔ کمانا (کم سے) بنگال کی پیداوار ہے۔ خریدنا۔ فرمانا۔ بخشنا۔ لرزنا۔ نوازنا گزرنا وغیرہ فارسی افعال بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ قبول سے قبولنا بھی لیا جاتا ہے مول سے مولنا اور خرید سے خرید کرنا ٹکسال باہر ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اردو جذباتی زبان ہے وہ جذباتی (EMOTIONAL) بھی ہے اور عقلی (RATIONAL) یعنی منطقی بھی بقول علامہ اقبال

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

زیادہ تر اس نے دل کو پاسبان عقل کی نگرانی میں رکھا لیکن کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑا ہے۔ پاسبانی عقل کا تقاضا تھا کہ مرکبات میں اجزا کی ترتیب فطرت کے مطابق ہو۔ جیسے ذیل کے مرکبات میں ہے:۔

چھوٹا بڑا۔ پتلا چپٹا۔ نیا پرانا۔ رہا سہا۔ بندھا ٹکا۔ پڑھا لکھا۔ لیا دیا۔ کھایا پیا۔

لیکن آہنگ کی رعایت سے اردو والے ٹکا بندھا۔ بڑا چھوٹا۔ لکھا پڑھا بھی بولتے ہیں۔ اردو آہنگ کی بڑی رسیلی ہے۔ ترکیب عطفی کی صورت میں معطوف علیہ (جزو اول) اردو میں چھوٹا ہوتا ہے اور معطوف (جزو ثانی) بڑا تاکہ واؤ عطف جزو اول کے ساتھ مل کر اسے طویل بنا دے اور دونوں جزوں میں توازن یعنی آہنگ برقرار رہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

شب و روز۔ صبح و مسا۔ باغ و بہار۔ لیل و نہار۔ پیر و جوان۔ ناز و نعم۔ کیف و طرب۔ شور و شغب۔ غیظ و غضب۔ قلب و جگر۔ کم و بیش۔

سچ بھی اردو کا ایک رجحان ہے اردو کے اپنے مرکبات عطفی جن کے درمیان

حروف عطف نہیں ہوتے اس رجحان کے آئینہ دار ہیں ۔

اڑوس پڑوس۔ سان بن۔ آس پاس۔ بن ٹھن۔ تام جھام۔ جل تھل۔ جھل مل۔ چھل بل۔ رم جھم۔ سج پج۔ کام دھام۔ لوٹ پوٹ۔ نٹ کھٹ۔ رس بس (اصل میں رچ تھا (مرکب ہے رچ بمعنی جذب ہونا اور بس سے) رچ کو بس کے تعلق سے رس بنا لیا)

اردو کے حکائی الفاظ بھی اسی شمار میں ہیں۔ چھم چھم۔ کھٹ کھٹ۔ جھر جھر بھر بھر۔ سر سر۔ دھم دھم۔ کھڑ بڑ۔ کھٹ پٹ۔ سٹ پٹ۔

توابع مہمل بھی اسی رجحان کو پیش کرتے ہیں۔ روٹی ووٹی۔ شرم ورم۔ پانی وانی۔ بادل وادل۔

منطق کی طرح اردو کٹر[۲] اصول پرست نہیں، سیال اور لچکیلی زبان ہے بعض الفاظ اردو میں جمع استعمال ہوتے ہیں جیسے 'معنی' مثلاً اس کے کیا معنی ہیں یا دستخط اس نے دستخط کئے۔ دن، روز، ماہ، مہینہ، سال کی اردو جمع نہیں بناتی۔ میں نے تین ماہ سے اسے نہیں دیکھا۔ تین سال سے وہ غائب ہے، تین دن میں اس کا کیا حال ہو گیا۔

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
(آتش)

شجر سایہ دار کی کثرت کے باوجود فعل مفرد لایا گیا ہے۔ سودا کا شعر ہے۔

تم اپنے بیل معنی کو نکالو　　مرے ہاتھی سے دو ٹکڑا اٹھا لو

یہاں 'دو ٹکڑیں' چاہیئے تھا۔ انشاء اسے صحیح نہیں بتاتے۔ 'اس کے پاس لکھو کا مدپیہ ہے' وغیرہ۔ آپ کے کہنے! کیا خوب (کیسا خوب) "ہے گا" 'میں نہ ہے' اور 'گا' دونوں یکجا ہیں۔

الفاظ کی حد تک اردو بڑی آزاد منش اور ملنسار واقع ہوئی ہے[۱]۔ اس نے ہر زبان

---

[۱] ڈاکٹر چٹرجی کہتے ہیں کہ ہندوستانی اپنی فطرت میں آزاد ترین اور معقول ترین زبانوں میں سے ہے (ص ۱۴۸)

سے فیض اٹھایا ۔ ہر گوشے سے تمتع حاصل کیا ۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، پنجابی پوربی، برج، پرتگالی، اطالوی، انگریزی ہر زبان کے الفاظ اس نے دل کھول کر قبول کئے جہاں کوئی لفظ نظر پہ چڑھا اس نے آنکھوں سے لگایا اور ادنیٰ تصرف کے بعد اپنایا۔ اردو کی اس فطرت کو دیکھ کر لوگ طعنہ دیتے ہیں کہ وہ بہت بھیڑا اکلی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اردو کی ترقی اور کامیابی کا راز اس کی ملنسار طبیعت ہے کہ وہ ہر زبان سے گھل مل جاتی ہے لفظوں کے ترک و اختیار کا معیار خود اردو کی فطرت ہے وہ آزاد کوہستانی چشمے کی طرح ہے جو کسی رکاوٹ کے بغیر بہتا اور گنگناتا چلا جاتا ہے کوئی اس کی راہ نہیں بتاتا وہ خود چٹانوں کے درمیان سے اپنا راستہ تراشتا ہے ۔ نواب نصیر حسین خیال اردو کی ایک ٹکسال کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ نواب محمد امیر خاں انجام کی نگرانی میں دہلی میں قائم ہوئی تھی جہاں الفاظ و محاورات وضع ہوتے ان پر تصدیق کی مہر لگائی جاتی اور ان کا اجرا ہو جاتا۔ یہ خیال کی خیال آرائی ہے ۔ دہلی یا لکھنؤ میں اس قسم کی کوئی ٹکسال نہ تھی اردو کی ٹکسال عوام کی بولی ٹھولی ہے جہاں سے الفاظ کو چلن ملا ۔ زبانوں کی خراد پر چڑھ کر یہ الفاظ سڈول بنے تو شعرا اور انشا پردازوں کے دربار تک ان کی رسائی ہوئی ۔ اردو کبھی کسی علمی ادارے، جماعت یا انجمن کی سند کی محتاج نہ تھی اس کی فطرت خود سند ہے اس کا مزاج سب سے بڑا تصدیق نامہ ہے ۔

ہے مگر تاثیر و شیرینی جو اردو بات میں
علم کے صدقے میں ہے یا فقر کی خیرات میں
پیشواؤں نے جگہ دی اپنی تصنیفات میں
منہ لگایا اگلے درویشوں نے ملفوظات میں
ان غریبوں سے ملی اکثر امیروں کو مدد
اردوئے شاہی کو پہنچائی فقیروں نے رسد (ناطق)

(۹)

"ارتقائی مدارج"

مولانا شیرانی ارشاد فرماتے ہیں[1]:-

"تغلقوں کے عہد میں دہلی میں جس قسم کی زبان بولی جاتی تھی اگر ہم کو اس کے نمونے دیکھنا ہیں تو قدیم دکھنی اردو کے ادبیات دیکھنے چاہئیں جو اس زبان کے بہترین ہیں۔ دکھنی زبان میں شعروشاعری کا آغاز اواخر قرن نہم سے شروع ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس عہد تک کی بعض تصنیفات ہم کو مل جاتی ہیں۔ ان میں سب سے قدیم میراں جی شمس العشاق کی تصنیفات ہیں۔"

سید محمد حسینی گیسو دراز (متوفی ۸۲۵ھ) کا رسالہ معراج العاشقین شائع ہو چکا ہے جو دکنی ادب کی دریافت شدہ کتابوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کے لسانی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم دکنی زبان دہلی کی موجودہ اردو سے مختلف نہ تھی یا اتنی مختلف نہ تھی جتنا اختلاف دہلی کی اردو اور بعد کی دکھنی اردو میں ہے۔ معراج العاشقین میں

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۷۰

'سی' لاحقۂ استقبال استعمال نہیں ہوا یہ لاحقہ دکنی میں راجستھانی سے آیا۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں۔ "بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجپوتانے سے آیا ہو"[1] تجہ مجہ دکنی اردو میں بطور اضافی ضمائر عام طور سے مستعمل ہیں۔ معراج العاشقین میں ان کی جگہ اردو کی معیاری ضمیریں 'میرا' 'تیرا' استعمال ہوئی ہیں۔ دکنی میں ماضی مطلق کے آخری حرف سے پہلے 'ی' مخلوط ہوتی ہے۔ جیسے ملیا (ملا) سنیا (سنا) چلیا (چلا) رہیا (رہا)۔ معراج العاشقین میں بھی 'ی' موجود ہے لیکن 'دیکھا' اور 'رکھا' دو صیغے اس میں 'ی' کے بغیر استعمال ہوئے ہیں۔ دکنی میں جمع 'اں' کے اضافے سے بنتی ہے۔ معراج العاشقین میں ایک مقام پر کان کی جمع کانوں (اں کے ساتھ) دیکھی گئی ہے۔ دکنی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پنجابی کی طرح جمع مؤنث کی صورت میں علامتِ اضافت کو اس میں جمع بنالیا جاتا ہے جیسے "بہشت کیاں حوراں" لیکن معراج العاشقین میں 'پیر کی باتاں' اور 'معشوق کی باتاں' جیسی ترکیبیں ملی ہیں۔ جن میں 'کی' علامت اضافت مضاف کی جمعیت کے باوجود مفرد ہے۔ دکنی کی ایک اور خصوصیت ہے کہ وہ اکثر مخلوط ہا حروف کے بعد کے عنصر کو گراکر ان کی تخفیف کرلیتی ہے۔ معراج العاشقین میں ذیل کے کلمے اردو کی طرح مخلوط ہا استعمال ہوتے ہیں

بیٹھنا۔ ٹھہرنا۔ پوچھنا۔ دیکھنا۔ اٹھنا۔ چھپنا۔ رکھنا۔ دکھلانا۔ پونچھنا۔ سمجھنا۔ پڑھنا۔ کھانا۔ چھوڑنا۔ کھڑا۔

تغلقوں کے عہد کی دہلوی زبان دکن و گجرات کی اس اردو سے مختلف تھی جس کے نمونے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے دکنی شعرا کے کلام میں ملتے ہیں اس لئے قدیم دہلوی زبان کا عکس دکھنی ادب کے آئینے میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ دہلی کی اردو سلطان علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور کے ہمرکاب

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۱۰

۱۳۱۴ء میں دکن پہنچی۔ اس کے بعد محمد تغلق نے ۱۳۲۶ء میں جب اپنا پایۂ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کیا اور دہلی اور اس کے نواح کے باشندے ہجرت کر کے دولت آباد گئے تو اردو بھی ان کے قدموں سے لگے لگے دکن گئی۔ لیکن دکن کا دہلی سے تعلق منقطع ہوتے ہی دکنی اردو، دہلی کی اردو سے بے نیاز ہو گئی۔ یہ بے نیازی ساڑھے تین سو سال تک قائم رہی" جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اردو متعدد امور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض محاورے سے (دہلوی اردو سے) مختلف[1] ہو گئی" مولانا شیرانی فرماتے ہیں:-

"اردو زبان دہلی میں آنے والے سیاسی واقعات اور ماحول سے برابر متاثر ہوتی رہی۔ اس لئے بدل بدلا گئی۔ دکنی تغلقوں کے عہد کی زبان کی جو دہلی میں بولی جاتی تھی تقلید کر رہے ہیں۔"

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کوئی زبان ایک حال پر قائم نہیں رہتی اور اس کا ماحول اور سیاسی واقعات کے اثرات سے بے نیاز گزر جانا ناممکن ہے۔ دہلی کی اردو پر ماحول اور سیاسی واقعات کا اثر پڑا لیکن دکن کی اردو اپنے ماحول اور گرد و پیش کے گوناگوں تغیرات سے محفوظ رہی۔ دکنیوں نے تغلقوں کے عہد کی زبان ہی کو بند ریا کی کھلونے کی طرح سینے سے لگائے رکھا۔ کیوں؟ مولانا شیرانی نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس کی یہ وجہ بتاتے ہیں کہ

"شمالی ہندوستانی پر کھڑی کا ایسا گہرا اثر مرتسم ہوا کہ اس کی بہت سی ابتدائی یا اصلی خصوصیتیں مفقود ہو گئیں اور جو کچھ باقی رہیں وہ مسخ شدہ حالت میں ہیں اس کے برخلاف دکھنی میں قدیم سے قدیم شکلیں اور خصوصیتیں بالکل محفوظ ہیں جن

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۲۷

کی بنا پر وہ جدید پنجابی کے بہت کچھ مشابہ ہے[1]۔"

شمالی ہندوستان پر کھڑی کا گہرا اثر مرتسم ہوا اور دکھنی راجستھانی و گجراتی کے اثر سے محفوظ رہی کیوں؟ اس پر پاس پڑوس کی زبانوں کے اثرات کس لئے مرتسم نہیں ہوئے؟ ڈاکٹر زور ہندوستانی لسانیات و ادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہیں کھڑی بولی کے اثرات کا تجزیہ کر کے دکھانا تھا اور ساتھ ہی بتانا تھا کہ دکھنی اردو گجراتی اور راجستھانی اثرات سے کس لئے محفوظ رہی۔

ڈاکٹر میجوس بلاک کی رائے ہے:۔

"ہندوستانی سپاہی جو اپنی زبان (اردو) کو شمالی ہند اور دکن لے کر گئے پنجاب خاص کے باشندے نہ تھے۔ اس لئے کہ پنجابی اردو سے مختلف اور ممتاز زبان ہے۔ وہ مشرقی پنجاب، انبالے، شمالی دوآبے کے رہنے والے تھے۔"

ان کے خیال میں:۔

مشرقی پنجاب کے سرحدی اضلاع کی زبان ہندوستانی سپاہیوں کے ہمرکاب دکن پہنچی[2]۔"

میں اس رائے کو حقیقت سے قریب تر سمجھتا ہوں۔ اردو کی قدیم صورت وہ ہے جو بالائی دوآبے میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر اور انبالے کی موجودہ بول چال کی اردو سے قریب ہے۔ یہ زبان مسلمان سپاہیوں کے ساتھ ملک کے ہر حصے میں پہنچی۔ شمال و جنوب کے ہر ضلع تک اس کی رسائی ہوئی۔ یہ جہاں گئی وہاں کی زبان سے گھل مل گئی! اس نے ملک کی ہر زبان سے فیض اٹھایا۔ ہر گوشے سے تمتع حاصل کیا۔ دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح سے شمالی ہند کی زبان کا تعلق قائم رہا اس لئے وہ اپنی اصل سے نہ بچھڑ سکی۔ اس کی وحدت

---

[1] ہندوستانی لسانیات صفحہ ۹۹

[2] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ج ۵ صفحہ ۳۴۰۔

برقرار رہی۔ جنوبی ہند میں بہمنی بادشاہوں کی خودمختاری کے بعد ہی اس کا تعلق شمالی ہند کی زبان سے منقطع ہو گیا۔ ساڑھے تین سو سال تک دکھنی اردو اپنی ماں شمال کی اردو سے مل سکی۔ پاس پڑوس کی اجنبی زبانوں دراوڑی، گجراتی، راجستھانی سے گھل مل رہی اور رشتے قائم کرتی رہی۔ ساڑھے تین سو سال کی طویل جدائی اور اجنبی زبانوں سے خلا ملا شمالی ہند کی اردو اور دکنی اردو کے درمیان اختلافات کا ذمہ دار ہے یہ اختلافات کچھ صوتی قسم کے ہیں جو یہ ہیں:۔

(۱) دکنی میں ایک حرکت پیش اور واؤ کے درمیان ہے۔ یہ دراوڑی سے لی گئی ہے اور اکثر انہی الفاظ میں پائی جاتی ہے جو ان زبانوں سے اردو میں آئے۔ جیسے پٹا (چھوکرا)، دیا (موٹا)، ڈپا (ٹوپی)

(۲) دکنی طویل حرکت کو کوتاہ کر لیتی ہے۔ جیسے:۔

ادمی (آدمی) اسمان (آسمان) بھگنا (بھیگنا) سنگھنا (سونگھنا)

(۳) دکنی کا میلان مشدد حروف کی طرف ہے جیسے:۔

چننا (چنا) پھکا (پھیکا) ہتّی (ہاتھی)

(۴) دکنی مخلوط ہا حروف کے ہائیہ عنصر کو گرا کر حرف کی تخفیف کر لیتی ہے جیسے سمدی (سمدھی)، باندنا (باندھنا) کدر (کدھر) گڑا (گڑھا) سیڑی (سیڑھی)، بڑاپی (بڑھاپی) مج (مجھ)، تج (تجھ) کچ (کچھ)۔

صرفی نحوی اختلافات میں سے مندرجہ ذیل اہم ہیں:۔

(۱) دکنی 'اں' کے اضافے سے جمع بناتی ہے جیسے گھراں۔ ادمیاں۔ پیالاں۔

(۲) دکنی ماضی مطلق (فعل متعدی) کو بطور معروف استعمال کرتی ہے اور اردو بطور مجہول۔ دکنی میں فعل فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ اردو میں مفعول کے مطابق۔

نوٹ:۔ یہ تفصیلات اور مثالیں زیادہ تر ڈاکٹر زور کی کتاب 'ہندوستانی لسانیات' سے ماخوذ ہیں۔

لڑکا روٹی کھایا۔ لڑکے روٹی کھائے۔ لڑکی لڈو کھائی لڑکی لڈواں کھائی۔

(۳) دکنی مصادر کے آخر میں ں مغنہ ہوتا ہے۔ جیسے مارناں۔ کھاناں وغیرہ

(۴) ماضی مطلق کے ماقبل آخر دکنی میں "ی" مخلوط ہوتی ہے۔ سنیا پڑھیا۔

(۵) دکنی "گا" کے ساتھ ساتھ "سی" لگا کر بھی فعل مستقبل بناتی ہے۔

(۶) دکنی میں "سو" "ہے" کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے ممکن کی انکھ سوں غیر نہ دیکھنا سو (ممکن کی آنکھ سے غیر کو نہ دیکھنا ہے)

(۷) اچھ "ہونے" کے معنی میں دکن میں مستعمل ہے۔

(۸) ہمن۔ تمن، اد ہما، تمنا وغیرہ ضمائر کی شکلیں اردو کی معیاری ضمیروں سے مختلف ہیں۔

ان میں سے حرکات کی تغیر، حروف صحیح کی تشدید، اور حائیہ حروف کی تخفیف کو لسانی حیثیت سے میں اہم نہیں سمجھتا۔ دکنی اردو کی یہ خصوصیات زیادہ تر منظوم کلام سے ماخوذ ہیں۔ ہو سکتا ہے نظم کی کڑی پابندیاں ان تصرفات کی ذمہ دار ہوں دکن کے شعرائے نے جن کے سامنے اردو نظم کا کوئی نمونہ نہ تھا ضرورت شعری سے مجبور ہو کر اکثر اس نوع کے تصرفات کیے۔ اور مذکر کو مونث، مونث کو مذکر، مخفف کو مشدد، مشدد کو مخفف، متحرک کو ساکن، ساکن کو متحرک باندھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کلمے اس زمانے میں بول چال کی زبان میں اسی طرح رائج تھے۔ اس کے علاوہ دکنی میں تشدید ہی نہیں تخفیف و تسہیل بھی دیکھی گئی ہے۔ دکنی شعرائے نے ہات (ہاتھ) آگ (آگ) آج (اج) کال (کل) اتیا، ایتی (اتنا۔ اتی) چونا (چننا) رکھے (دکھے) تایئں (تئیں) ھاڈ (ہڈی) جاگا (جگہ) لوہو (لہو) وغیرہ کلمات عام طور سے استعمال کیے ہیں۔ نمونوں میں ذیل کے کلمے سہل ہیں۔

پھاندا (پھندا) پوتلی (پتلی) کیرن (کرن) آنجھو (انجھو) ویسنا (دسنا) چاتر (چتر)

موں (منہ)۔

صرفی نحوی اختلافات میں سے 'ں' کا حصہ جمع، جو دکنی کی نمایاں ترین خصوصیت ہے راجستھانی سے لیا گیا ہے۔ اس پہ پنجابی اثر بھی ہو سکتا ہے۔ اضلاعِ پانی پت، سہارنپور اور مظفر نگر میں بھی جیسا کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے، جمع کا یہ قاعدہ رائج ہے[1]۔ البتہ ماضی مطلق کا استعمال بطور معروف ڈاکٹر گریرسن کی رائے میں تمام دراوڑی زبانوں کا شرمندۂ احسان ہے۔

"مدراس اور بمبئی کے جنوبی حصے میں گرد و پیش کی دراوڑی زبانوں کے زیرِ اثر ماضی مطلق کا مجہولی استعمال ترک کر دیا گیا۔ متعدی اور غیر متعدی افعال اب ایک انداز سے استعمال ہوتے ہیں۔ ہر چند فاعل بہ جز ترکیب میں نائب فاعل ہوتا ہے۔ 'نے' بھی آتا ہے، لیکن 'نے' کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور فعل عدد و جنس میں فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ بمبئی کے وسطی علاقے میں مرہٹی کی موجودگی نے فعل متعدی کے مجہولی استعمال کو ہنوز برقرار رکھا ہے[2]"

مصادر کے 'ن' (مغنونہ) کی بابت گریرسن لکھتے ہیں کہ وہ قدیم ہے اور سنسکرت علامتِ بے جنس 'م' (کرنم = کرناں) کی یادگار ہے۔ یہ 'ں' ہریانی اردو میں بھی تھا اس لئے ہو سکتا ہے بانگڑو علاقے کے سپاہی اسے اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔

ماضی مطلق کی 'ی' پر پہلے بحث کر کے بتا چکا ہوں کہ وہ قدیم اپ بھرنش کی یادگار ہے۔ ہر چند دہلی کی قدیم زبان میں ماضی کی 'ی' نہیں ملی لیکن یہ چونکہ مخلوط التلفظ ہے۔ اس لئے اس کا امکان ہے کہ اردو کی سادگی اور سہل انگاری یا نازک طبعی کی وجہ سے تخریب صوتی کی نذر ہو گئی ہو۔ میں اسے پنجاب کا اثر نہیں سمجھتا۔

---

[1] کلیات ولی صفحہ ۳۹

[2] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ اول صفحہ ۵۸

مستقبل کا 'سی' اور مصدر کا 'سو' بعد کی پیداوار ہیں اور غالباً راجستھانی سے دکنی میں درآمد ہوئے۔ ان میں سے 'سی' 'مس' کی شکل میں پراکرت میں بھی تھا۔ اور جیساکہ میں نے اوپر عرض کیا، اس کی موجودہ تخفیفی شکل اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ پنجابی نہیں۔ اگر پنجابی ہوتا تو مخفف نہ ہوتا۔ 'سو' 'ہو' کا قدیم روپ ہے اور 'اس' (ہونا) سے لیا گیا ہے۔ یہ ہریانی اور دکنی میں راجستھانی سے آیا۔ ہمن، ہمّن اور اچھ (سنسکرت اس بھنی ہونا) پر بھی راجستھان کی چھاپ ہے۔ 'اس'، 'ہ' یا 'ہے' کی بجائے گجراتی اور مارواڑی زبانیں 'اچھے' اور 'چھے' استعمال کرتی ہیں۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں شعر و شاعری کا آغاز دکن سے ہوا یا یوں کہیے کہ باقاعدہ اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی شمالی ہند میں زیادہ تر فارسی' برج یا اودھی کا چرچا تھا۔ مسلمان فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے اور ہندو برج یا اودھی میں۔ اگرچہ کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے مسلمان برج اور اودھی سے اور ہندو فارسی سے شغل کر لیا کرتے تھے۔ اکبر کے حسب ذیل دو شعر ڈاکٹر چیٹرجی نے نقل کئے ہیں۔ یہ دونوں برج میں ہیں:۔

جاکو جس ہے جگت میں جگت سراہے جاہی   تاکو جنم سپھل ہے کہتا اکبر ساہی

(جس کی دنیا میں شہرت ہے اور جسے دنیا سراہتی ہے اکبر بادشاہ کہتا ہے۔ اسی کی زندگی کامیاب ہے)

دوسرا شعر ہے:۔

پیتھل سوں مجلس گئی تان سین سوں راگ   ہنسبو رمبو بولبو گیو بیربل ساتھ

(پرتھی راج کے اٹھ جانے سے مجلس کی رونق گئی اور تان سین کے اٹھ جانے سے راگ رنگ۔ لیکن بیربل اپنے ساتھ ہمارا ہنسنا، کھیلنا اور بولنا لے گیا)

اورنگ زیب دکن میں تھا۔ بنگال کا ایک مسلمان طویل سفر کر کے اس کا مرید بننے

آیا تو اورنگ زیب نے اُسے یہ شعر پڑھ کر سنایا:۔

ٹوپی لیندے بلدی دیندے کھرے تلیچ ـــــ چوہا کھاندا ماولی توکل باندھے پیچ

(ٹوپی لیتے ہیں بڑے بال دیتے ہیں ترے بے شرم! چوہا گھر کھود ڈالتا ہے اور توکل پیچ درست کرے گا۔)

یہ شعر پنجابی میں ہے۔

شمالی ہندوستان میں اٹھارہویں صدی سے پہلے قدیم اردو یعنی کھڑی میں جو کچھ کہا گیا وہ دل بہلانے کے لئے تھا۔ لسانی اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہی۔ ادب میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ دہلی میں اردو شاعری صحیح معنی میں دکنی کے اثر سے شروع ہوئی جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے جسے ڈاکٹر زور نے تذکرۂ بے جگر کے ایک مخطوطے سے نقل کیا ہے[۱] ثابت ہوتا ہے۔

"چوں درسن ثانی جلوس محمد شاہی دیوان او (ولی) بدہلی رسید موزوں طبعان بلند فکر و عالی تلاش ہم عصر مثل حاتم و آبرو و فغاں بہ تتبع زبانش پیرو و ہم زبان شدند"۔

دہلی کے دور اول کے شعرائے صرف اسلوب ہی میں ولی کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ زبان بھی انہوں نے وہی لکھی جو ولی اور دکن کے دوسرے شعرا کے یہاں استعمال ہوتی تھی تقلید اور تتبع کا سلسلہ متقدمین شعرا کے دورِ دوم تک چلا۔ میر و میرزا سے پہلے اگرچہ دکنی زبان کے خلاف دہلی میں ردعمل شروع ہو گیا تھا اور اصلاح زبان کی تحریک کی بنیاد حاتم و مظہر کے ہاتھوں پڑ چکی تھی۔ لیکن دکنی الفاظ و محاورے ناسخ کے زمانے تک چوری چھپے اردو شعرا کے کلام میں راہ پاتے رہے۔ قائم چاندپوری کہتے ہیں:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ـــــ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

---

[۱] ہندوستانی لسانیات صفحہ ۱۱۶

اس سے مولانا شیرانی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ میر و مرزا کے زمانے کی اردو دکنی اردو یعنی پنجابی سے مختلف نہ تھی۔ بعد میں شعرائے نے تصرفات کر کے اُردو میں برہمی پیدا کر دی۔

"ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے۔ کہ ان کی اصلاح و ترمیم کے اصول نے ایک عربی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی پیدا کر دی ہے۔"[۱]

۱۷۰۰ء کے شروع میں جب دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا تو دہلی کی زبان دکنی اردو سے مختلف تھی۔ یہ اختلاف شعرا کی اصلاحات اور تعلیم یافتہ طبقے کے تصرفات یا جدتوں کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ان اسباب کی وجہ سے جن کا ذکر میں نے اوپر کی سطروں میں کیا۔ دکن و گجرات کی اردو گجراتی، راجستھانی، مراوڑی اثرات قبول کر کے دہلی کی اردو سے دور جا پڑی تھی۔ اور اپنی اصل سے بچھڑ گئی تھی۔ اگر دہلی کی اردو دکن کی زبان سے اس وقت مختلف نہ ہوتی تو شیخ سعد اللہ گلشن ولی کو ہرگز یہ مشورہ نہ دیتے

"شما دکنی را گزشتہ ریختہ را موافق اردوے معلی شاہجہاں آباد موزوں بکنید"

اور شاہ حاتم یہ نہ فرماتے:۔

"فقط روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویانِ رند در محاورہ دارند منظور داشتہ"

دہلی کی زبان میں الفاظ و محاورات کا داخلہ دکنی شعرا کے اثر سے ہوا۔

ڈاکٹر گریرسن لکھتے ہیں:[۲]

---

[۱] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۰۳

[۲] ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ صفحہ ۵۸

اردو شاعری کی دکن سے ابتدا کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اردو نظم میں جو شمالی ہند میں لکھی گئی دکن کے مخصوص محاورات راہ پا گئے اردو نثر ان محاورات سے خالی ہے۔"

قائم چاندپوری کے ذیل کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ اول کے عہد تک دکن میں جو زبان بولی یا لکھی جاتی تھی وہ دہلی کی رائج الوقت زبان سے مختلف تھی۔

"از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمان بہادر شاہ اول کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند۔۔۔ ہر چند اکثر الفاظ غیر مانوس گوش مامردم مستعمل ایشانست لیکن چونکہ موافق زبان دکن راست و درست است پیش ہمہ کس راہ بدو دارد[1]۔"

مولانا شیرانی دہلی کے اردو شعرائے اصول اصلاحات کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔

"ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے انہوں نے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی پیدا کر دی ہے" ان اصلاحات کا تعلق ان الفاظ، محاورات اور صیغوں سے ہے جن کا دہلی میں رواج نہ تھا اور جو دکن کی اردو شاعری کے اثر سے دہلی کی زبان میں رواج پا گئے تھے۔ قائم کے لفظوں میں وہ دہلی والوں کے لئے اجنبی اور نامانوس تھے۔ دہلی کے شعرا نے انہیں اس لئے اپنے لسانی سرمایہ سے نہیں نکالا کہ اردو کی اصلاح ان کے پیش نظر تھی یا استبدادی طور پر وہ زبان میں تراش خراش کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ الفاظ اور محاورے اردو زبان کے نہ تھے۔ ولی اور اس کے ہم عصر شعرائے دکن کے اثر سے ریختہ میں راہ پا گئے تھے اور دہلوی اردو کا جزو نہ بن سکے تھے۔ صرف نظم میں مستعمل تھے۔ نثر میں ان کا رواج نہ تھا۔ اردو میں ان کا چوروں کی طرح داخلہ زبان میں برہمی و ابتری پیدا کر رہا تھا۔ اس لئے ریختہ کے باغ کو اس خس و خاشاک سے صاف کرنا ضروری تھا۔

---

[1] مخزن نکات صفحہ ۳۱

"ڈاکٹر چیٹرجی کا خیال ہے کہ مسلمان سپاہیوں کے ہمراہ دکن و گجرات جانے والی کوئی ایک زبان نہ تھی۔ ایک دوسرے سے ملتی جلتی کئی بولیاں ساتھ ساتھ دکن گئیں، جو گول کنڈہ میں مل جل کر ایک ہو گئیں۔ اُردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے اس میں جو بول میں اردو غالب رہی لیکن پنجابی، برج، ہریانی عناصر گھل مل کر اردو کا گوشت پوست بن چکے تھے اس لئے جب تک اورنگ زیب نے دکنی ریاستوں پر حملہ کر کے انہیں ممالک محروسہ میں شامل نہ کر لیا یہ اجنبی عناصر دکنی اردو سے جدا نہ کئے جا سکے۔ یوں تو ہجرت کر کے دکن جانے والے پنجاب کے گوجر، ہریانہ کے جاٹ اور ہندوستانی علاقے کے بے شمار لوگ تھے لیکن دکنی اردو کا نام اول اول گجری تجویز ہوا جسے دکن کے شعراء اور مصنفین نے بھی پسند کیا۔ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں[1]:۔

"ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ بعض دکنی مصنف بھی اپنی گجراتی آمیز ہندوستانی کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے"

میراں جی شمس العشاق کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) کتاب حجتہ البقاء میں فرماتے ہیں:۔

جیسے ہوویں گیان بچاری — نہ دیکھیں بھاکا گوجری

محمد امین کی مثنوی "یوسف زلیخا" عالمگیر کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ یہ دکنی زبان میں ہے لیکن امین اسے گجری کے نام سے یاد کرتے ہیں:۔

سنو مطلب اچھے اب یو امیں کا — لکھی گجری منے یوسف زلیخا

ہر اک ہاکا ہے قصہ فارسی میں — امیں اس کو اتاری گوجری میں

کہ بوجھے ہر کدام اس کی حقیقت — بڑی ہے گوجری جگ بیچ نعمت

---

[1] ہندوستانی لسانیات صفحہ ۱۰۴ -

ڈاکٹر چیٹرجی کہتے ہیں ؎۔ دکنی کا نام گجری اس کی اصلیت اور مشابہت کا آئینہ دار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے گوجر جنہوں نے پنجاب کے دو شہروں کو گجرات اور گوجرانوالہ کا نام دیا شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ ہجرت کر کے دکن گئے تو انہوں نے اپنے نام اور بولی کو کچھ دن کے لئے زندہ اور قائم رکھا۔"

اس سلسلے میں یہ امر غور کے قابل ہے کہ مولانا شیرانی کے خیال میں غیاث الدین تغلق نے جس کی زندگی کا بڑا حصہ پنجاب میں گذرا پنجاب کی زبان کو دہلی پہنچایا۔ غیاث الدین ۷۲۰ھ میں پنجابیوں کے بڑے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ ۷۲۸ھ میں غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق پنجابیوں کے اس لشکر کو لے کر دکن روانہ ہو گیا۔ اس کے لشکر نے صرف آٹھ سال دہلی میں قیام کیا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق دہلی کی زبان کو دکن لے گیا۔ تو یقین کیجئے کہ وہ دہلی کی زبان نہ تھی جو دکن گئی اس لئے کہ دیبالپور کے سپاہی پنجابی بولتے ہوئے دہلی گئے تھے جو آٹھ سال دہلی میں قیام کرنے کے بعد دکن روانہ ہو گئے۔ آٹھ سال کے اندر نہ وہ دہلی کی زبان سیکھ سکتے تھے کہ اس کو اپنے ہمراہ لے کر دکن جاتے اور نہ دہلی کی اردو کو اپنے قیام کے زمانے میں پنجابی سے متاثر کر سکتے تھے۔ یہ مولانا کا محض قیاس ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ واقعات اور حالات اس کی تائید نہیں کرتے۔

بہر حال دکنی اردو میں پنجابی اثرات دکن کی پیداوار ہیں۔ دہلی کی قدیم زبان پنجابی اثرات سے پاک تھی۔ یہ اثرات دکن کی زبان میں پنجاب سے آئے یا جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا۔ گجرات اور راجستھان کی بولیوں سے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق دوسرے خیال کے موید ہیں۔

• وفات نامہ حضرت فاطمہ مصنفہ حضرت اسماعیل امروہوی کے تبصرے

؎ انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۸۶-۱۸۵ ۔

یں میں نے چند مثالیں پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ دکھنی اور گجری یا گجراتی دراصل وہی زبان ہے جو دلّی سے ان علاقوں میں پہنچی البتہ اس میں مقامی الفاظ اور ترکیبیں بھی شامل ہو گئیں[1]۔"

مولانا شیرانی کو بھی اس کا احساس تھا کہ جو الفاظ و مصادر آج کی پنجابی اور قدیم دکنی میں مشترک ہیں وہ برج، گجراتی اور اودھی میں بھی ہیں اسلئے ہو سکتا ہے کہ دکنی اردو نے انہیں برج یا گجراتی سے لیا ہو لیکن وہ اپنے اس احساس کو یہ کہہ کر دباتے رہے،

"یہ سب بحیثیت مجموعی (برج، گجراتی یا اودھی میں) نہیں ملتے اس لئے ہم اس قیاس میں حق بجانب نہیں ہیں کہ اردو نے ان مصادر کو برج یا دیگر زبانوں سے لیا ہے[2]"

یہ مصادر بحیثیت مجموعی برج یا گجراتی میں نہیں ملتے۔ اس لئے جو ملتے ہیں وہ بھی برج یا گجراتی سے ماخوذ نہیں۔ کیوں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ سب مصادر ایک زبان سے ماخوذ ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کچھ برج سے لئے گئے ہوں اور کچھ گجراتی اور پنجابی سے نسنا ایک مصدر ہے جو پنجابی میں بھاگنے کے معنی دیتا ہے۔ سنسکرت میں یہ نش (فنا ہونا بھاگ جانا) تھا۔ اس سے نشٹ (خراب و برباد) حالیہ تمام وضع ہوا۔ جو ہندی اور بنگلہ میں آج بھی ہے۔ پراکرت نے 'نش' کے 'ش' کو 'س' سے بدل کر 'نس' بنایا اور 'نشٹ' سے ایک نیا کلمہ 'نٹھ' گھڑا۔ نسنا۔ نٹھنا ہم معنی الفاظ ہیں۔ اول الذکر مادۂ فعل سے وضع ہوا اور ثانی الذکر حالیۂ تمام سے۔ لہٰذا اور سندھی نے 'س' کو 'ہ' سے بدلا 'نہنا' وجود میں آیا۔ قدیم پنجابی میں 'نہا' مستعمل تھا۔ سندھیوں کا یہ جملہ تاریخ فیروز شاہی سے اوپر نقل ہو چکا ہے۔ "برکت شیخ نہیا۔ ایک موا ایک نہا" یہیں 'نہا' 'نسا' کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ پنجابی کے بیرونی مزاج کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ 'نسا' پنجابی نہیں گجراتی ہے پنجابی اور

---

[1] اردو جنوری ۵۲ء ص ۱۲

[2] پنجاب میں اردو ص ۱۲۹

قدیم دکنی دونوں نے اسے گجرات سے درآمد کیا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (متوفی ۱۰۳۷ھ) کی کتاب 'نورس' کے مطالعے سے دکنی پر برج کے اثرات کا سراغ ملتا ہے اس کتاب میں مصنف نے جو دوہے بطور مثال درج کئے ہیں ان میں بہت سے برج آمیز دکنی زبان میں ہیں مثلاً ذیل کے دوہے میں:۔

حوریاں پریاں چھپیاں کوُ وا کاس کوُ پتال

(حوریں اور پریاں چھپ گئیں۔ کوئی آسمان میں جا چھپی اور کوئی زیرِ زمیں)

'کوُ' برج ہے۔

ایک شعر ہے:۔

حضرت محمد جگت گرگسائیں   تو درگہ چمک میرو من سار

(حضرت محمد جگت گرو یعنی معلمِ عالم ہیں۔ تیری درگاہ مقناطیس ہے اور میرا من لوہا)

اس میں تو درگہ (تیری درگاہ) دکنی اور میرو من (میرا من) برج شیر و شکر ہو گئے ہیں۔

ذیل کے مصرعے میں:۔

من چاہے سو نس بھئی ہم تم ہوئیں اب سکھی

(دل جس شب کا خواہاں تھا وہ آگئی، ہم تم اب خوش کیوں نہ ہوں)

نس بھئی (رات ہوئی) خالص برج ہے)

لچھن اکھیں ابراہیم کو تاکار

(کوکا ابراہیم یہ صفت بتاتے ہیں)

اس میں لچھن اور اکھیں برج سے لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ذیل کے الفاظ کتاب نورس میں برج کے پیشے کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔

وا (اس)، تا (اس)، مو (مجھ)، جے (جو)، لون (نمک)

ذیل کا شعر برنج میں ہے:-

نیم نس مو پر ہی لاگت سوم آوت مو مناون
مو پر ہی اگن جل دیکھت آوت ہو یم کرن

(نصف شب مجھ برہن کو منانے چاند آتا ہے اور آتش فراق سے جلتا دیکھ کر مجھے ٹھنڈا کرتا ہے)[1]

دکن اور گجرات کی اردو میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ چند مقامی الفاظ اور محاورات ہیں جو گجراتی اردو میں ہیں دکنی میں نہیں۔ یا دکنی میں ہیں گجراتی اردو ان سے خالی ہے مثلاً میں (حرف جر) کے معنی میں دکنی عام طور سے 'منے' استعمال کرتی ہے اور گجراتی 'مانہ' مانہی اور مہیں۔ خوب محمد چشتی کہتے ہیں۔

جتناں طالب کوں بس ہوئے   میں اس مانہہ کہیا ہوں سوے

'سوے' بمعنی 'سب' بھی گجراتی ہے۔

گجراتی عام طور سے لفظ کی حرکت کو کھینچ کر طویل بنالیتی ہے جیسے۔
کوتا (کتا) کال (کل) گھاٹنا (گھٹنا) پھیر (پھر) کھیلا (کھلا) ایتا (اتا) ایتی (اتی)

ڈاکٹر ندوہ آخری حرفِ علت کے بعد 'ن' غنہ کا اضافہ گجراتی اردو کی خصوصیت بتلاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کہناں (کہنا)، ہلنیں جلنیں (ہلنے جلنے) منیں (منے۔ میں) چلنیں (چلنی) خوبیں (خوبی)، سیتیں (ستے۔ سے)

دکن کی طرف اردو نے دو بار ہجرت کی۔ پہلی مرتبہ تغلقوں کے ہمراہ چودھویں

---

[1] ملاحظہ فرمایئے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ "کتب نورس" مطبوعہ "اردو ادب" بابت اپریل ؛ جون ۱۹۵۲ء

صدی عیسوی میں جس کا ذکر اوپر تفصیل کے ساتھ کیا گیا۔ دوسری مرتبہ سترھویں صدی میں جب اورنگ زیب جرار لشکر لے کر دکن کی طرف روانہ ہوا اور اورنگ آباد کو اس نے اپنا مستقر بنایا۔ اردو کی اس دوسری ہجرت کی وجہ سے شمال کی اردو کا تقریباً ساڑھے تین سو سال کی طویل جدائی کے بعد دکن کی اردو سے ملاپ ہوا۔ دونوں پیار سے ملیں۔ گلے شکوے ہوئے اور دونوں کے دل کے غبار جو ایک کو دوسرے سے جدا کئے ہوئے تھے، دور ہو گئے۔ — مولوی عبدالحق فرماتے ہیں[1]:-

"اس دور میں اورنگ آباد کی تقریباً پوری آبادی شمالی ہند کی آبادی تھی۔ اور سارا رنگ ڈھنگ دلی کا سا نظر آتا تھا۔ سراج کے کلام کا مقابلہ آبرو، حاتم، ناجی، وغیرہ سے کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ہی قلم کے شاعر ہیں"

اردو کی تاریخ میں اس دور کی بڑی قدر و قیمت ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو کا عمومی معیار اس دور میں قائم ہوا۔ ڈاکٹر چیٹرجی کا خیال ہے کہ لفظ اردو اس دور کی پیداوار ہے اس سے پہلے اردو کو ہندی یا ہندوی کہا جاتا تھا۔ دہلی کی زبان اورنگ زیب اور اس کی سپاہ کے ہمرکاب دکن پہنچی۔ جہاں دکنی مسخ شدہ شکل میں بولی جاتی تھی شعر و سخن کے چرچے بھی تھے۔ دکنی سے امتیاز کے لیے دکنیوں نے فرودگاہ شاہی کی زبان کو زبان اردوئے معلی کے نام سے یاد کیا اردو اس کا اختصار ہے[2]۔

ڈاکٹر چیٹرجی کا یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ دہلی کی زبان کا نام اردو قدیم ہے اور جیسا کہ میں نے اس مقالے کے پہلے باب میں عرض کیا اردو کو یہ نام اس وقت ملا جب بارھویں صدی عیسوی میں مسلمان سپاہیوں نے اسے گلے لگایا اور شاہی کیمپ میں پال پوس کر پروان چڑھایا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دکنیوں نے اردو کو کبھی

---

[1] مقدمہ گل عجائب صفحہ ۹۱
[2] انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۸۲

اردو کے نام سے نہیں پکارا۔ وہ اسے ہندی یا ہندوی کہتے رہے اور جب اپنی زبان سے تمیز کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے شمال کی اردو کو ہندوستانی یا زبانِ ہندوستان کے نام سے یاد کیا[۱]۔ اردو یا زبانِ اردوئے معلی کا استعمال اگرچہ اورنگ زیب کے عہد سے پہلے نہیں ہوا لیکن اس کے قریب سراج الدین علی خاں آرزو اور ان کے بھانجے میر تقی میر نے اس لفظ کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب سے پہلے بھی دہلی کی زبان کو عام طور سے اردوئے معلی کہا جاتا تھا۔ میر کے اقتباسات باب اول میں درج ہو چکے ہیں۔ خان آرزو کے دو اہم اقتباسات درج ذیل ہیں۔

لفظ "چھنال" کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۲]۔

"معلوم نیست لغت کجاست۔ ما مردم کہ اہلِ ہندیم و در اردوئے معلی مے باشیم نشنیدہ ایم"

اردوئے معلی سے دہلی کی چھاؤنی مراد ہے اس لئے کہ آرزو دہلی میں رہتے تھے

"آں شعر لیست بہ زبانِ ہندی اہلِ اردوئے ہند غالباً بطریق شعر فارسی دراں الحال بسیار رائج ہندوستان است و سابق در دکن رواج داشت بہ زبان ہماں ملک[۳]"

"زبانِ اہلِ اردوئے ہند" کہہ کر آرزو اس کو صاف کر دیتے ہیں کہ دہلی کے شاہی عسکر کی زبان ہونے کی وجہ سے اردو کو زبانِ اردوئے معلی کہا گیا۔

شمالی ہند میں اردو پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد، بہار، اودھ ہر جگہ گئی۔ لیکن اس کے تعلقات دہلی کی اردو سے قائم رہے اور اگر کبھی منقطع بھی ہوئے تو جلد پھر قائم ہو گئے اس لئے ان مقامات کی اردو دہلی کی اردو سے بچھڑنے نہ پائی۔ چند جزوی اور سرسری اختلافات کے سوا جو بول چال تک محدود تھے اس کا معیاری

۱۔ انڈو آرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۸۸

۲۔ نوادر الالفاظ صفحہ ۲۱۴

۳۔ داد سخن مجموعہ مقدمہ نوادر الالفاظ صفحہ ۳۳ ۔

رہا جو دہلی کی اردو کا تھا۔ دہلی زبان کا مرکز تھا۔ دوسرے مقامات کی اردو بولنے والے اپنی بول چال میں دہلی کی زبان سے انحراف پاتے تو اس کی اصلاح کر لیتے اور اپنی اردو کو دہلی کے روزمرہ اور محاورے کے مطابق ڈھال لیتے۔ اس سے ان مقامات کی اردو مقامی بولیوں سے بہت کم متاثر ہوئی اور جو تھوڑا بہت غیر شعوری تاثر راہ پا گیا تھا وہ ادبی ترمیم و اصلاح کے بعد دور ہو گیا ہر جگہ دہلی کی زبان رواج پا گئی۔ ادھر دہلی پر مصائب کی گھٹائیں چھائیں تو دہلی والے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور جسے جہاں گوشۂ عافیت ملا فروکش ہو گیا۔ کوئی مشرق گیا تو کسی نے مغرب کی راہ لی۔ جتنی مرتبہ دہلی کا سہاگ اجڑا اتنی ہی مرتبہ شمالی ہند کے دوسرے مقامات آباد ہوئے۔ اور اس شر سے خیر کی یہ صورت نکلی کہ دہلی کی اردو اپنی اسی نکھری ہوئی شکل میں سارے ملک پر چھا گئی۔ ہر جگہ اس کا ڈنکا بجنے لگا۔ انشاء اللہ خاں انشا لکھتے ہیں:[1]

"ایں جمیع (باشندگانِ دہلی) ہر جا کہ برسند از آنجا دہلی وال گفتہ شوند و محلۂ ایشاں محلۂ اہلِ دہلی۔ و اگر تمام شہر را فرا گیرند آں شہر را اردو نامند"

دہلی والے جب آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تو وہاں اودھی (پوربی) بولی جاری تھی۔ اردو نے اودھی کو نکال باہر کیا اور خود اس کی جگہ راج کرنے لگی۔ اہلِ دہلی پورے شہر پر قابض ہو گئے۔ اور لکھنؤ لکھنؤ نہیں رہا دلی بن گیا۔

"در لکھنؤ از سبب قرب تمام شاہ جہاں آبادیاں فصیح و غیر فصیح جمع شدہ اند و ایں شہر جہاں آباد شدہ است لکھنؤ نماندہ است"[2]

لکھنؤ والے ہر لفظ کی تحقیق اہلِ دہلی سے کرتے اور بات چیت، لب و لہجہ اور تلفظ میں ان کی ریس فخر سمجھتے۔ انگریز کی سازشوں کے اثر سے لکھنؤ دہلی سے سیاسی۔

---

[1] دریائے لطافت

[2] ایضاً

طور پر آزاد ہوا۔ تو گویا اسے لسانی استقلال کا پروانہ مل گیا۔ اب وہ زبان کے نام پر تصرفات ہونے لگے تراش خراش شروع ہوئی قطع و برید کی گئی۔ اس سے زبان کو فائدہ تو کیا ہوتا الٹا نقصان ہوا۔ زبان کی مرکزیت ختم ہوگئی جو زبان کے ارتقا کے لئے ضروری تھی۔۔۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اردو کا ایک معیار قائم ہو گیا تھا۔ اور یہ معیار دہلی کی زبان تھی۔ ملک کے ہر حصے میں شعر و سخن کیلئے دہلی کی زبان "زبانِ متعارف" کی حیثیت رکھتی تھی۔ لکھنؤ کے تصرفات نے "زبانِ متعارف" کو صدمہ پہنچایا۔ زبان کا ارتقا فطرت کے مطابق ہوا کرتا ہے غیر فطری پابندیاں لگانے سے اس میں ایک طرح کا تکلف آجاتا ہے اور اس کا ارتقا رک جاتا ہے۔ اہلِ لکھنؤ کے تصرفات، جیسا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ خارجیت کا اثر تھے۔ جدت کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے اردو کو بہت سے ٹھیٹ الفاظ اور بول چال کے محاورے عامیانہ قرار دے کر ترک کر دیے اور ان کی جگہ عربی کے ثقیل الفاظ اور فارسی کی مشکل ترکیبیں داخل کر دیں[1]۔ لکھنؤ والوں کی یہ اختراعات ہیں جن پر انہیں فخر ہے لیکن زبان کے فطرت شناس جانتے ہیں کہ ان سے اردو کا قدرتی بہاؤ رک گیا اور اس کا فطری سرچشمہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

دہلی سے قطع تعلق کے بعد لکھنؤ کی اردو اودھی کے اثر میں آئی۔ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں[2]

"لکھنؤ مشرقی ہندی کے علاقے میں آباد ہے اور وہاں کی اردو، وہاں کی اودھی سے بہت کچھ متاثر ہوئی ہے"۔

ایک زمانہ تھا کہ بقول حکیم احمد علی یکتا[3]۔

"زبانِ مردمانِ لکھنؤ کہ از قدیم الایام باشندۂ آں جا ہستند و ہمہ در زبانِ عمال

---

[1] آسان اردو مطبوعہ نقوش فروری مارچ ۱۹۵۲ء
[2] ہندوستانی لسانیات صفحہ ۱۲۱
[3] دستور الفصاحت مقدمہ۔

بفصاحت نزدیک تر ہو چکا ہے

مردمانِ لکھنؤ کی زبان فصاحت سے نزدیک تر ہونے کی وجہ یہ تھی۔

"شعراء شیریں کلام و دیگر خوش بیاناں کہ مدار محاورہ بریں بزرگان است ہم بجائگاہ وزیر ممدوح (نواب آصف الدولہ) حاضر بودند و متہا بسر بودند[1]"

جب تک "لکھنؤ والے اپنے کو دہلوی سمجھتے رہے اور وہاں کے قلیل باشندوں کو پوربی[2]"۔ جب تک انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ "ہم پورب میں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کے آدمیوں کی زبان کی عادت پڑ جائے[3]" ان کی زبان دہلی کی زبان کے مطابق رہی لیکن دہلی کے اثرات سے آزاد ہوتے ہی ان کی زبان بدلنی شروع ہوئی۔ انشا کے زمانے میں یہ تبدیلی دو چار لفظوں تک محدود تھی۔

"ان کی زبان ایک دو لفظوں میں دہلویوں سے مغائرت رکھتی ہے[4]" بعد میں بڑھ کر اس نے زبان کے دوسرے اہم عناصر پر بھی سایہ ڈالا۔ اور سی تذکیر و تانیث کے باب میں کسی قدر لاپرواہی واقع ہوئی ہے۔ اس لاپروائی کا اثر لکھنؤ کی زبان پر یہ ہوا کہ۔

(۱) بہت سے الفاظ جو دہلی میں مذکر تھے لکھنؤ والوں نے انہیں مونث ٹھہرایا اور جو مونث تھے انہیں مذکر بتایا۔

(۲) مذکر الفاظ جن کے آخر میں کوئی حرفِ صحیح ہو۔ فاعلی حالت میں جمع نہیں ہوتی۔ اہلِ لکھنؤ نے 'یں' بڑھا کر جمع بنائی جیسے برسیں۔ شہریں۔ نفلیں۔ چیتیں۔

(۳) عربی کے مونث الفاظ کی جمع خواہ مکسر ہو یا سالم اہلِ لکھنؤ نے مذکر استعمال کیا اور اسے فصیح سمجھا۔

(۴) 'تا' (علامتِ استقبال) اردو میں منصرف ہے جو قاعدے کے مطابق مذکر میں

۱۔ دستور الفصاحت مقدمہ
۲۔ ترجمہ دریائے لطافت صفحہ ۴۱
۳۔ ایضاً ۴۲
۴۔ ترجمہ دریائے لطافت صفحہ ۴۶

'نا' مذکر و مؤنث میں 'نی' ہو جاتی ہے۔ جیسے مجھے روٹی کھانی ہے۔ اسے سبق پڑھنا ہے۔ اہلِ لکھنؤ نے ہر حال میں اسے 'نا' رکھا۔ جیسے بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے اس کے علاوہ 'نے' کے استعمال میں انہوں نے بڑی بے قاعدگی کی بعض افعال کی ماضی پر 'نے' آنا چاہیئے۔ جیسے پڑھنا۔ سوچنا۔ بولنا (جب اس کے ساتھ مفعول ہو) انہوں نے ان پر 'نے' داخل نہیں کیا۔ وہ خوب پڑھے۔ وہ اتنا نہ سوچے۔ وہ جھوٹ بولے۔ اس نوع کے جملے ان کے یہاں عام ہیں۔

لفظ 'تاکید ہی' کو جب انہوں نے ان، تم، ہم پر داخل کیا تو اودھی کی تقلید میں 'ہیں' بناکر 'انہی کو' 'انہیں'، 'تمہی کو' 'تمہیں' اور 'ہمی کو' 'ہمیں' کہا۔ یہ تصرف انشا کے زمانے میں رائج ہو چکا تھا اور شجاع الدولہ کے عہد میں اسے صحت و فصاحت کی سند مل چکی تھی۔ دریائے لطافت ۱۸۰۸ء میں لکھی گئی۔ اس میں انشا تصریح کرتے ہیں[1]۔

"انہیں" در اصل "انہی" سے باشد لیکن حالا استعمال لفظ نیکوتر از اصل باشد۔"

ان چند جزوی اثرات کے علاوہ لکھنؤ کی اردو پر اودھی کا اور کوئی نمایاں چھینٹا نہیں پڑا اس لیے اہلِ علم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور اسے چنداں اہمیت نہیں دی۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ چند مقامی الفاظ اور محاورات میں معمولی سا فرق تھا جو پہلی بڑی جنگ کے بعد ختم ہو گیا۔ ان قدیم لسانی مراکز کی زبانیں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئیں اور لسانی وحدت میں ڈھل گئیں۔ بہت سے الفاظ جو صرف دہلی میں مستعمل تھے لکھنؤ میں بھی استعمال ہونے لگے اور اس کے برعکس لکھنؤ کے الفاظ اور محاورے دہلی میں رواج پا گئے۔ 'جھلک' میں اہلِ لکھنؤ نے تصرف کر کے 'جھلکی' بنایا۔ آج جھلکی ہر شخص کی زبان پر ہے۔ 'کھم' اور 'بھتم' دونوں

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۱۲۱

پہلو بہ پہلو رائج ہیں۔ پیں بول جانا اور چیں بول جانا میں اب کچھ فرق نہیں کیا جاتا۔ شرالیور آج ایسا ہی مستند ہے جیسا شور لیور۔ زبان کی ترقی کے لئے آج اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کا کوئی معیار ہو۔ اور معیار مرکز کی تعیین کے بغیر مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۰)

اُردوے قدیم

پچھلے ابواب میں تفصیل سے بتایا جاچکا ہے کہ آج جس زبان کو ہم اردو کہتے ہیں وہ آریائی قبائل کے ہمراہ پاک و ہند آنے والی قدیم پراکرت کے کسی قدیم تر بولی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ زبان کی علم فطرت کے مطابق یہ زبان کبھی ایک سمت پر قائم نہیں رہی، برابر الٹتی بدلتی اور زمانے کے ختم نہ ہونے والے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف بہتی رہی۔ اس کا نام اردو اس کو تیرہویں صدی عیسوی میں ملا جب مسلمانوں کی سرپرستی میں اس کا احیا ہوا اور اس نے ایک نئی زندگی پائی۔ لفظ اُردو اس نئی زندگی کی یادگار ہے۔ اردو نے اب تک اپنی اس نئی زندگی کی ساڑھے چھ صدیاں گزاری ہیں جن میں سے پہلی چار صدیاں (۱۳۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک) اس کی زندگی کے قدیم دور کی آئینہ دار ہیں۔ ۱۷۰۰ء کے بعد اس نے نئی زندگی کے نئے دور میں قدم رکھا۔ فارسی زبان کے ذخیرے سے تو وہ پہلے ہی روشناس ہو چکی تھی ۱۷۰۰ء کے بعد فارسی شاعری کے رنگارنگ امکانات تک اس کی رسائی ہوئی۔ ان

امکانات کو اپنی فطرت میں سمو کر اس نے اپنے کو اس قابل بنالیا کہ آج برصغیر کی ہمسر زبانیں اس سے آنکھ ملاتے شرماتی ہیں۔

چودھویں صدی کے شروع میں وہ دکن و گجرات بھی گئی اور وہاں وطن سے دور خوب خوب پروان چڑھی۔ پردیس کی قدیم زندگی کی جھلک تو دکنی ادب کے آئینہ میں نظر آجاتی ہے۔ لیکن دہلی کی قدیم زندگی ہنوز تاریکی میں ہے۔ اس پر سے ابھی اچھی طرح پردہ نہیں اٹھا ہے۔

خواجہ مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۹ء) کی بابت محمد عوفی صاحب لباب الالباب اور میر خسرو نے لکھا ہے تین دیوان ان کی یادگار ہیں ان میں سے ایک ہندوی زبان میں ہے۔ اس پر حکیم شمس اللہ قادری اور مولانا شیرانی فرماتے ہیں خواجہ ہندی میں شعر کہا کرتے تھے۔ میں اپنے مقالے کے پہلے باب میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمان اہل علم نے ہر چند اردو کو ہندی یا ہندوی کے نام سے یاد کیا لیکن وہ ہندوستان کی دوسری قدیم و جدید بولیوں کو بھی ہندی کہا کئے۔ مسلمانوں کے لئے ہندی ایک علم لفظ تھا جسے وہ اردو پنجابی بہاری برج، اودھی کے علاوہ پراکرت اور اپ بھرنش کے لئے یکساں طور سے استعمال کرتے اور جب تخصیص کی ضرورت پیش آئی تو وہ ان زبانوں میں سے کسی ایک زبان کی طرف اضافت کرکے کہتے 'ہندی' برج 'ہندی' اودھ۔ چنانچہ خان آرزو نے جب خاص دہلی کی اردو مراد لی تو انہیں زبان ہندی اہل اردو جیسی عجیب و غریب ترکیب وضع کرنی پڑی۔

مسعود سعد سلمان کا کلام دستبرد زمانہ کی نذر ہوگیا۔ اگر دستیاب ہو بھی جاتا تو چنداں سود مند نہ تھا اس لئے کہ وہ رائج الوقت پنجاب کی اپ بھرنش زبان میں تھا یا سنسکرت میں۔ اس زمانے میں سنسکرت فارسی کی طرح ادب اور شعر کی زبان تھی۔ محمود غزنوی کے عہد میں جو سکے ہم دریافت ہوئے ہیں ان پر سنسکرت زبان میں

یہ الفاظ منقوش ہیں[۱]۔

• ادیکتم ایکم، محمد اوتار، نرپتی محمود، ایم ٹنکو محمود پورے گھٹے جتو۔

ترجمہ: بے نشاں ایک ہے۔ محمد اس کے رسول ہیں۔ محمود امیر المومنین ہے۔ یہ ٹنکا محمود پور کے دارالضرب میں ڈھالا گیا۔

اردو کا ارتقا دکھانے کے شوق میں ہمارے اکثر اہلِ علم اردو کی شخصیت کو ملحوظ نہیں رکھتے اور اردو کی معاصر زبانوں کے نمونے اردو کے نام سے پیش کر دیتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے قریب برصغیر میں اپ بھرنش کا راج تھا جو جدید آریائی بولیوں کی جگہ ملک میں بولی جا رہی تھی۔ اس سے ترقی پا کر آج کی آریائی بولیاں وجود میں آئیں جن میں سے ہر ایک دسویں صدی کی خاص اپ بھرنش کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اردو بھی کسی ایک اپ بھرنش کی کوکھ سے پیدا ہوئی۔ میں اپنے مقالے میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ یہ اپ بھرنش دہلی اور میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جا رہی تھی۔ دسویں صدی کے قریب صرف یہی ایک اپ بھرنش نہ تھی جس سے اردو نے ارتقا پایا۔ اس کے ساتھ آس پاس اور بھی کئی اپ بھرنشیں تھیں جو ہر چند اردو کو جنم دینے والی اپ بھرنش کی عزیزہ ہیں اور اس سے قریب کی قرابت رکھتی ہیں لیکن اردو کے سلسلۂ نسب میں نہیں آتیں۔ اردو نے اُن سے ارتقا نہیں پایا۔ اس لئے اردو کے عہد بہ عہد ارتقا کے سلسلے میں ان کا ذکر کرنا اور ان کے ادبی نمونوں کو قدیم اردو کے نمونے بنا کر پیش کرنا مناسب نہیں۔

برج، اودھی، راجستھانی اردو سے مختلف ہیں۔ یہ مانا کہ یہ زبانیں اردو سے بہت ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اردو سے فیض بھی اٹھایا ہے لیکن جہاں اردو کا ارتقا دکھانا مقصود ہو وہاں ان زبانوں کے ادبی نمونے پیش کرنا ایسا ہے جیسے احمد کی ٹوپی محمود کے سر۔ مولانا شیرانی کی علمی قابلیت اور لسانی تبحر مسلّم، لیکن یہ ایک

---

(۱) جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۶ء ضمیمہ (۲۳۶)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اپنی قابلِ قدر کتاب میں اردو کا ارتقاء دکھاتے ہوئے قطبن اور شیخ عثمان وغیرہ شعرا کا کلام پیش کر دیا۔ مولانا اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ لودھی کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام اردو ہی ہیں سب اردو ہی جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کی بابت میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ وہ ملی جلی زبان ہے جس میں راجستھانی ہریانی اور پنجابی عناصر قدیم ہندی (ہندوستانی) کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔

بابا فرید گنج شکرؒ (متوفی ۱۲۶۹ء) کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان کا ریختہ مولانا شیرانی کے حوالے سے درج کیا جا چکا ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ ریختہ بابا فرید گنج شکر کا ہے۔ پروفیسر بلدیو سنگھ نے حضرت بابا فرید کے ۱۳۰ شلوک اور ۴ شبد اورینٹل کالج میگزین میں شائع کئے تھے۔ اور انہیں تیرھویں صدی عیسوی کی اردو زبان کا نمونہ بتایا تھا۔ ڈاکٹر چٹرجی ان شلوکوں کو گرو نانک کے معاصر بابا فرید (سولھویں صدی) کی تصنیف بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ غلطی سے بابا فرید گنج شکرؒ کی طرف منسوب کر دئے گئے ہیں۔[1]

امیر خسروؒ (متوفی ۱۳۲۵ء) سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے کھڑی بولی میں شعر کہے لیکن ان کا کلام، جو ان کے نام سے تذکروں میں نقل ہوتا آیا ہے، ایک تو بڑی حد تک مشکوک ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انہی کا ہے۔ دوسرے وہ برج آمیز اردو میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو عناصر کی اس میں بہتات ہے۔ برج کے چند الفاظ و افعال اس میں شامل ہوئے ہیں۔ ان کی مشہور غزل ہے:

ز حال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

۱؎ انڈو آرین اینڈ ہندی ۱۶۹

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کو درائے راکھوں جو جاں پاؤں پیا کی گھتیاں

یہ صاف اور نکھری ہوئی کھڑی بولی میں ہے لیکن آٹے میں نمک کی طرح
اس میں بھی برج کی آمیزش ہو گئی ہے۔ چھتیاں، رتیاں، بتیاں، پتیاں وغیرہ الفاظ اور
'درائے' اور 'راکھوں' وغیرہ افعال برج کے ہیں۔ ذیل کی پہیلیاں بھی ملی جلی زبان میں ہیں۔

اجل برن ادھین تن اک چت دو دھیان
دیکھت میں تو سادھو ہے نپٹ پاپ کا کھان

اک نار ترور سے اتری ماں سے جنم نہ پایو!
باپ کا ناؤں جو واسو پوچھیو آدھو ناؤں بتایو
آدھو ناؤں بتایو خسرو کون دیس کی بولی
واکو ناؤں جو پوچھیو میں نے اپنے ناؤں نہ بولی

ایک گنی نے یہ گن کینا ہریل پنجرے میں دے دینا
دیکھو جادو گر کا حال ڈارے ہرا نکالے لال

یہ پہیلیاں ٹھیٹ ہندوی میں ہیں۔

ایک تھال موتی سے بھرا سب کے سر پہ اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے موتی اس سے ایک نہ گرے
آدے تو اندھیری لاوے جاوے تو سب سکھ لیجاوے

کیا جانوں وہ کیسا ہے جیسا دیکھا ویسا ہے

اِک کہانی میں کہوں تو سن لے میرے پوت
بنا پروں وہ اُڑ گیا باندھ گلے میں سوت

ہری اودھ خسرو کا خالص اُردو کلام اور پہیلیاں درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں[1]
"خسرو کا نواس (بود و باش) دلی میں تھا۔ میرا وچار ہے کہ اس کے انتوا (اور) میرٹھ کے آس پاس جو بولی اس سمے (وقت) بولی جاتی تھی اس پر درشٹی (نظر) رکھ کر انہوں نے اپنی رچنائیں (شعر کہے) اس لئے وہ ادھک تر (زیادہ تر) بول چال کی بھاشا (زبان) کے انوکول (مطابق) ہیں۔ اور اسی سمان میں وشیش (خاص) صفائی آگئی ہے"

خسرو کے بعد کبیر (پندرہویں صدی عیسوی) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کبیر بنارس کے رہنے والے تھے اس لئے ان کی زبان جیسا کہ خود ان کا بیان ہے:-

بولی میری پورب کی تاہے چینے نہ کوئی

مشرق کی معیاری اور مستند اودھی ہے۔ لیکن ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ کھڑی میں بھی ہے جسے مولانا شیرانی نے نقل کر دیا ہے۔ کبیر نے 'بارہ ماسہ' بھی لکھا تھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

سبھی بھیس میں کھیل گنوائی پیہ کی نیہا نیک نیں پائی
سات پہر کھر میں جات نہ جانی گرو کی بچن نیک نیں مانی
چھن چھن دیہہ بھی ات جینئل پیہ کو سمرن کبھو نہ کینال
سب جوبن اکارت کھویو برہی نام کبیرا رویو

اس میں پوربی کی آمیزش ہے

---

[1] ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس صفحہ ۲۴۰

یہ غزل ملاحظہ ہو۔

کاسی گیا اور دوارکا تیرتھ شکل بھرمت پھرا
گاہنتی نہ کھول کپٹ کی تیرتھ گیا تو کیا ہوا
پڑھتی کتابیں بانچتا اوروں کو نت سمجھاوتا
زکرکی محل کھوجے نہیں بک بک مرا تو کیا ہوا
قاضی کتابیں کھوجتا کرتا نصیحت اور کو
محرم نہیں اس حال سے قاضی ہوا تو کیا ہوا
شطرنج چوپڑ گنجفہ اک نرد ہے بدرنگ کی
بازی نہ لائی پریم کی کھیلا جوا تو کیا ہوا
جوگی دگمبر سے بڑا کپڑے رنگے رنگ لال سے
واقف نہیں اس رنگ سے کپڑا رنگا تو کیا ہوا

کبیر بچناولی اور کبیر گرنتھاولی کے نام سے کبیر کے کلام کے جو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ سکھوں کے گرنتھ صاحب میں بھی ان کا کلام درج ہے، وہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔ اس کا صرف ایک بند ملاحظہ ہو۔

جب لگ میری میری کرے — تب لگ کاج ایک نہیں سرے
جب میری مٹ جائے — تب پربھو کاج سنوارے آئے
جب لگ سندھ ہوبن ماہی — تب لگ بن پھوے ناہی
جب ہی بیارو سنگھ کو کھائی — پھولی رہی سگل ترائی
جیتو بوڑے پار وترے — گرو پرسادی پار اترے
داس کبیر کہی سمجھائی! — کیول رام رہو جو لائی

شیخ جمالی (متوفی ۹۴۲ھ) بابر کے معاصر ہیں۔ مولانا شیرانی نے ذیل کی غزل

ان کے نام سے درج کر کے لکھا ہے کہ بعض تذکروں میں امیر خسرو کی طرف منسوب ہے۔

... ہر دو تیرا کتا ہے — موتیا شد بدر تو ستا ہے
خمار شدم نار شدم لٹ گیا — در رہ عشق تو کمر تا ہے
گریہ بدم گفت رقیب کتن — اس کا کہا مت کرو یہ جلتا ہے
گاہ نہ گفتہ کہ جمالی تو بیٹھ — ختم کرو کیا اپنا کرم پتا ہے

اس پر پنجابی اثر نمایاں ہے۔

عہد اکبری کے دو شاعروں کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے ایک لوری ہیں جو اعظم پور کے رہنے والے تھے۔ ملا فیضی سے بہت اتحاد تھا۔ میر حسن نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد — بے چارۂ لوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

دوسرے سعدی، قائم چاندپوری نے انہیں شیخ سعدی شیرازی سمجھا۔ میر تقی میر نے دکن کا باشندہ بتایا۔ وہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ ۱۰۰۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ بختاور خاں نے لکھا ہے[1]

"طبع موزوں داشت و بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے"

ذیل کی غزل ان کی طرف منسوب ہے۔

تشنہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے
گفتا کہ در شہر باورے اس ملک کی یہ ریت ہے
اے مرد ماں شہر شما، کتنی بری یہ ریت ہے
ہے ہے نمی پرسد کسے پیمو لیا ماریت ہے

---

[1] بحوالہ اردوئے قدیم طبع اول صفحہ ۱۱

ہنسا تن کو علی دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

دونین کی کھپر کہوں رو رو بجن دل کروں
پیش سگ کو یت دھروں پیاسا دجائیں سا ہے

سعدی طرح انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ در ریختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

آخر میں مولانا محمد افضل کا ذکر مناسب ہوگا۔ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں بود و باش تھی۔ ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا۔ بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی ان کی مشہور نظم ہے جس کا ایک بڑا حصہ مولانا شیرانی نے نقل کر دیا ہے۔ ان کی زبان کے بارے میں خود صاحب فرماتے ہیں کہ دکنی ہندوستانی سے خاص طور سے مختلف ہے[1]۔ صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی — بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھ کو سکھ دن، نا نیند راتا — برہ کی آگ میں سینہ جراتا
تمامی لوگ مجھ بوری کہیں ری — خرد گم کردہ و مجنوں کہیں ری
نہیں اس درد کا دارو کسی کن — پچھے حیراں سبھی حکمت فن فنون
اری جس شخص کوں یہ دیہہ لاگا — سیانا دیکھ اس کوں دور بھاگا
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے — کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے

قلیم نثر کے نمونوں میں سے میری اور دوسرے پر بھی راجح کا مندرجہ ذیل پروانہ جو بارھویں صدی عیسوی کا ہے اور جو اس نے کسی عطیے کے سلسلے میں لکھا تھا۔ نقل کیا ہے:۔

---

[1] رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۱۸

"شری شری دیلین مہاراجم دھیراجم، ہند استھلم راج دھانم، سبھی نہیں پورب دلی تشت (تخت) شری شری مہامم، راجم دھیراجم پرتھوی راجی اس ساتھنم اچارج رشی کیش دھنتری ایتن تم نے کاکاجی تم کہ دواکی آرامم چیتو۔ جن کے ریجم میں دو کر روپیہ ۵۰۰۰ تمرستانی گوڑے کا شرچار خرچہ ہمیشہ آویں گے کھجانم سے ان کو کوئی ماف (معاف) کریں گے۔ جن کو نیر کو کے ادھمکاری ہووئیں گے سبی دو ے علم کے ھنومنت را آئیہ"

اس میں تم نے، دواکی، آتی (ہاتی) گھوڑے کا خرچہ، آویں گے، کریں گے ہوویں گے وغیرہ الفاظ وافعال کھڑی بولی کے ہیں۔ لیکن یہ پروانہ، جیسا کہ ہری اودھ نے لکھا ہے، راجستھانی میں ہے۔ اسے اردو ے قدیم کی مثال کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

چودھویں صدی میں گورکھ ناتھ نے نثر میں بہت کچھ لکھا۔ ذیل کا اقتباس اردو سے بہت مشابہ ہے لیکن وہ برج آمیز راجستھانی میں ہے۔

" سو وہ پرش سمپورن تیرتھ استان کر چکو (کرچکا) ارو (اور) سمپورن پرتھوی برہمنی کو دے چکو (دے چکا) ارو سہر جگ کر چکو، ارو دیوتا سرو (سب) پوج چکو ارو پتری کو سن تشت کر چکو، سورگ لوک پراپت کر چکو، جا منشیہ کے من چھن ماتر برہم کو کے بچار بیٹھو"

گوسوامی ولبھ ناتھ اور ان کے صاحبزادے گوکل ناتھ کا زمانہ سولھویں صدی عیسوی ہے ان دونوں بزرگوں نے برج بھاشا میں کئی کتابیں لکھیں جن میں کھڑی بولی کی آمیزش ہے مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"سو ایک دن نند داس جی کے من میں ایسی آئی کہ جیسے تلسی داس جی نے رامائن بھاشا کری ہے۔ سو ہم ہوں شریمد بھاگوت بھاشا کریں۔ یہ بات برہمن لوگن نے سنی تب سب برہمن مل کے شری گوسائیں جی کے پاس گئے سو برہمن

نے بنتی کری۔ جو شری مدبھاگوت بھاشا ہوئے گی تو ہماری اجیو کا ردھ جاتے رہے گی۔"

اسی زمانے کے لگ بھگ گنگ کوی (بھاٹ) نے "چند چند برنن کی مہما" نام سے ایک کتاب تصنیف کی اس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ یہ اگرچہ خالص اردو میں نہیں لیکن نسبتاً اردو سے زیادہ قریب ہے۔

"شری شری پات ساہی جی (بادشاہ جی) دلپت جی (دل کے حاکم) اکبر ساہ جی آم کھاس (دربار عام خاص) میں تشت (تخت) اوپر براجمان ہو رہے۔ اور آم کھاس بھرنے لگا ہے جس میں تمام اُمراء آئے آئے کورنش بجائے۔ جہار کر کے اپنی اپنی بیٹھک پہ بیٹھ جائے کریں۔"[1]

---

[1] یہ اقتباسات میں نے ہری اودھ کی کتاب سے لئے ہیں۔

فہرست ماخذ و مصادر

(۱) آرزو (سراج الدین علی خاں)۔ نوادر الالفاظ مع غرائب اللغات

(۲) انشاء (انشاء اللہ خاں) دریائے لطافت۔ اصل و ترجمہ انجمن ترقی اردو بنگال کمیٹی

(۳) برنی کوف (اے) ۔ ادبی ہندی" مطبوعہ بلیٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز ج ۸ ۔

(۴) بنی کانت کاکتی۔ آسامی تعمیر و ارتقا ۱۹۴۱ء

(۵) بنارسی داس جین۔ پنجابی صوتیات۔

(۶) بابو رام سکسینہ۔ اودھی کا ارتقا'

(۷) بھنڈارکر (آر۔جی) ولسن لسانیاتی لیکچرز ۱۹۱۴ء

(۸) بومفورڈ (ٹریور) "مغربی پنجابی سے متعلق کچھ نوٹ" مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۸ء

(۹) بیمز (جان) ہند آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر ۳ جلد۔

—— چند بہاری کی گرامر کا مطالعہ مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۲ء

(۱۰) بیلی (ٹی۔ گراہم) "اردو۔ زبان اور اس کا نام" مطبوعہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء

—— "قدیم اردو ابیات چیت" مطبوعہ بلٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز جلد ۶

—— "کیا کھڑی بولی کے معنی گنوارو بولی ہیں؟" مطبوعہ بلٹن جلد ۸

(۱۱) ٹکر (ٹی۔ جی) مقدمہ زبان کی فطری تاریخ

(۱۲) ٹیسی ٹری (ایل۔ پی) گجراتی مارواڑی میں مفعولی اور اضافی لاحقوں کی اصل" مطبوعہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۳ء

(۱۳) ٹرنر (آر۔ ایل) نیپالی ڈکشنری

(۱۴) ٹیمپل (آر۔ سی) "پنجاب کے چند ہندو لوک گیت" مطبوعہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۸۲ء

(۱۵) جولس بلاک۔ "ہند آریائی لسانیات کے چند مسائل" مطبوعہ بلٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز جلد ۵

(۱۶) چیٹرجی (ایس۔ کے) "بنگالی کا آغاز و ارتقا"

—— "انڈو آرین اور ہندی"

—— "خطبہ صدارت اورینٹل کانفرنس" ۱۹۳۵ء

(۱۷) سدھیشور ورما۔ "آریائی زبانیں"

—— "لہندا صوتیات" مطبوعہ جرنل بنگال سوسائٹی ۱۹۳۶ء

(۱۸) سلیمان ندوی۔ نقوش سلیمانی

(۱۹) شیرانی (حافظ محمود خاں) پنجاب میں اردو

(۲۰) شمس اللہ قادری (حکیم) اردوئے قدیم

۲۱ عبدالحق (ڈاکٹر مولوی) قواعد اردو

——— اُردو کے نشوونما میں صوفیہ کرام کا حصہ۔
——— 'آسان اُردو' مطبوعہ رسالہ نقوش ۱۹۵۳ء
——— 'سب رس' ۔ مقدمہ
——— گل عجائب ۔ مقدمہ
(۲۲) عبدالستار صدیقی (ڈاکٹر) کلیات ولی ۔ مقدمہ
۲۳ کیفی (پنڈت دتاتریہ) کیفیہ
(۲۴) کیلاگ ہندی گرامر
(۲۵) گریرسن (جی۔اے) ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ جلد نہم حصہ اوّل
——— "ڈھکی پراکرت" مطبوعہ جرنل رائل سوسائٹی ۱۹۱۳ء
——— کشمیری زبان کے لوچتے
——— جدید ہند آریائی زبانوں کی بنیادی اور حالیاتی گردانیں | مطبوعہ جرنل بنگال سوسائٹی ۱۸۹۵ء
——— "ہند آریائی زبانیں" مطبوعہ بلٹن اسکول اور ینٹل اسٹڈیز جلد اوّل
(۲۶) قائم چاندپوری ۔ "مخزن نکات"
(۲۷) محی الدین قادری زور (ڈاکٹر) اردو شہ پارے
——— ہندوستانی لسانیات
——— ہندوستانی صوتیات
——— "دہلی میں اردو شاعری کا آغاز" مطبوعہ رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۶ء
(۲۸) میرزا خاں تحفۃ الہند
(۲۹) میر تقی میر نکات الشعراء
——— ذکر میر

(۳۰) نجیب اشرف ندوی۔ تبصرہ پنجاب میں اردو۔ مطبوعہ رسالہ معارف اگست ۱۹۲۸ء

(۳۱) نورالحسن ہاشمی (ڈاکٹر) اردو شاعری کا دبستان دہلی۔

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان" مطبوعہ رسالہ شاعر سالنامہ

(۳۲) ہری اودھ (ایودھیا سنگھ اپادھیائے) "ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس"

(۳۳) ہیورنلے (اے۔ ایف، آر) گوڑین زبانوں کی گرامر

۔ گوڑین زبانوں کی تقابلی گرامر

کی تائید میں مقالات مطبوعہ

جرنل بنگال سوسائٹی ۴۰، ۱۸۷۲ء

(۳۴) یسپرسن (او) زبان میں ارتقا

۔ انگریزی زبان کی ساخت، فطرت اور

نشوونما۔

اس کے علاوہ بعض اور ماخذ بھی ہیں جن سے جزوی مدد لی گئی ہے۔ ان کا ذکر موجب تطویل تھا اس لئے چھوڑ دیا گیا۔
